قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸
شمارہ نمبر ۳

ہفتہ ۱۹ فروری ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

فہرست مضامین

★
لمعات ۳
★
کوائف پاکستان ۵
★
عالم اسلامی ۶
★
تاریخی شواھد ۷
★
اسلام کی سرگزشت ۸
★
مجلس اقبال ۹
★
عورت کا قران ۱۰
★
جوانان تتاری ۱۱
★
ترک اور اسلام ۱۴
★
بین الاقوامی جائزہ ۱۵
★
باب المراسلات ۱۶
★
نقد و نظر ۱۷
★
حقائق و عبر ۱۷

قرآن نے کیا کہا

ایک بچہ نہ نظام کو کچھ سمجھ سکتا ھے نہ جماعت کو۔ اس کے سامنے باپ یا ماں سب سے بڑی حقیقت ہوتے ھیں۔ یعنی اس کی زندگی کا آسرا اشخاص کے ساتھ وابستہ ھوتا ھے۔

جب ذھن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اشخاص کو بڑی اھمیت دیتا تھا۔ بادشاہ مرگیا تو انقلاب آگیا۔ فوج کا سپہ سالار مارا گیا یا قید ھوگیا تو ساری فوج کو شکست ھوگئی۔ قوم کے سردار نے قوم کا ساتھ چھوڑ دیا تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ کسی ملک میں کوئی مفکر پیدا ھوگیا تو فکر کی دنیا جگمگا اٹھی۔ جب وہ مرگیا تو علم و بصیرت کے چراغ گل ھوگئے۔ غرضیکہ قوم اور ملک کی موت اور حیات اشخاص کے ساتھ وابستہ ھوتی تھی۔

قران آیا تو اس نے کہا کہ اب انسانیت کا قافلہ ایک نئی منزل میں پہنچ رہا ہے۔ اب تاریخ ایک نئے دور میں داخل ھورھی ھے۔ اب قوموں اور ملکوں کی تقدیر اشخاص کے بجائے نظام اور ملت کے ساتھ وابستہ ھوگی۔ جب تک ایک صحیح نظام اور اسے چلانے والی جماعت باقی رھیگی وہ قوم اور ملک زندہ رھیگا۔ جب نظام تباہ ھوجائیگا تو وہ قوم بھی تباہ ھو جائیگی۔ چنانچہ اس نے خود ایک نظام دیا جسے محمد رسول اللہ نے متشکل کرکے دکھا دیا اور اس سے قوم آسمان کی بلندیوں تک جاپہنچی۔ لیکن اس کے ساتھ ھی اس نے کہدیا کہ دیکھنا! تم نے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ تمہارا یہ عروج محمد رسول اللہ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ھے۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم (۳/۱۴۳)۔

محمد صرف ایک پیغامبر ھے۔ اس سے پہلے بہت سے پیغامبر گذر چکے ھیں۔ لہذہ اگر یہ مرجائے یا قتل ھوجائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤگے؟

مسلمانوں کی تباھی اس دن نہیں شروع ھوئی جس دن محمد رسول اللہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کی تباھی اسوقت شروع ھوئی جب ان سے قرانی نظام گم ھوگیا۔ لہذہ انہیں دوبارہ زندگی بھی کسی "آنے والے" کے ذریعے نہیں ملیگی۔ یہ اس

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

رابطہ باہمی

طلوع اسلام کے قارئین مختلف مقامات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں باہمی رابطہ کے لئے ضروری ہے کہ ہر شہر میں ایک "بزم طلوع اسلام" قائم کی جائے۔ اراکین بزم باہمی مشوروں سے یہ سوچیں کہ اس قرانی فکر کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد آپ اپنی تجاویز سے ہمیں مطلع کریں جنہیں (حسب ضرورت) طلوع اسلام میں شائع کیا جائیگا۔ واضع رہے کہ بزم کسی قسم کی الگ پارٹی نہیں ہوگی نہ ہی اس کی طرف سے کوئی لٹریچر (بلا اجازت طلوع اسلام) شائع کیا جائیگا۔ یہ صرف قرانی فکر سے ہم آہنگی رکھنے والوں کے مشاورتی اجتماعات کا زریعہ ہوگی۔ ہر بزم کا ایک ترجمان ہوگا جس کی وساطت سے بزم مدیر طلوع اسلام سے خط و کتابت کریگی۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو هفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک هفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی ۔ ۳

طلوعِ اسلام

جلد ۸ | ۱۹ر فروری ۱۹۵۵ء | نمبر ۳

سینۂ چاکانِ چمن

اسلام نے ایک ایسا نظامِ حیات دیا تھا جسے زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چل کر زندگی کے ہر شعبہ میں نوعِ انسانی کی راہ نمائی کرنی تھی۔ دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اسلام ایک تحریک (MOVEMENT) تھی جس کی ہستی کا مدار ہی حرکت پر تھا۔ اس میں جمود اور سکون آجانے کے معنی یہ تھے کہ اس کی ہستی باقی نہیں رہی۔ اس کا اعلان یہ تھا کہ

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

اس مقصد کے لئے قرآن نے زندگی کے کچھ مستقل اصول دیئے جنہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا اور انسان سے کہدیا کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کے حدود کے اندر رہتے ہوئے، زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے۔ یہ تھا وہ نظام جس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے اس جماعت کو جو کتاب اللہ کی وارث قرار پائی تھی اُمتِ وسطیٰ اور شہداء علی الناس بننا تھا۔ یعنی ایسی قوم جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ یہ خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کی مظہر ہو اور اس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کا سامان فراہم کرے اور اس طرح کاروانِ انسانیت کی قیادت کرتے ہوئے اسے اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے لیجائے۔ یہ اُمت محمد رسول اللہ کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آئی اور اس نے خدا کے نظامِ ربوبیت کو متشکل کر دیا جس سے زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھی۔ لیکن یہ کاروانِ نوردِ نکہت صحرائے حجاز میں ابھی چند قدم چلنے پایا تھا کہ رجعت پسندانہ قوتیں عجم کی کمین گاہوں سے ہجوم کر کے نکل آئیں اور نہایت معصومانہ انداز سے شریکِ کارواں ہو گئیں۔ ان کی دُوررس نگاہوں نے بہت جلد بھانپ لیا کہ اس جماعت کی قوت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک متحرک نظام کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ انہیں اس قوت سے محروم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسلام کو متحرک نظام کے بجائے ایک جامد مذہب میں تبدیل کر دیا جائے۔ وہ اپنی چال میں کامیاب ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ شعلۂ جوالہ قوم، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

ان کی اس چال کا نام زدہ حاضر کی زبان میں، مُلّا ازم تھا۔

مُلّا ازم ہی وہ اکاس بیل شجرِ ملت پر صدیوں تک چھائی رہی جس نے اس کے جسد میں زندگی کی کوئی بھی باقی نہ رہنے دی۔ چونکہ اس کی پشت پر ملوکیت کی طاقت موجود تھی اس لئے قوم اس کابوس کو اپنے سینے سے الگ نہ کر سکی۔ یہ، بادشاہوں کو ظل اللہ قرار دیکر، محراب و منبر سے ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی، اور بادشاہت، اسے اپنی سپر سمجھ کر اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچایا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ صدیوں تک چلا آیا۔ تا آنکہ بیسویں صدی عیسوی میں اس کے خلاف دو تحریکیں ابھریں جو اس کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک تحریک کا مرکز تھا ترکی۔ اور دوسری کا سرچشمہ ہندوستان رجو اب خطۂ پاکستان کے نام سے وجہِ رشکِ قلب و نظر ہے)۔ سطح بیں نگاہوں کو ان دونوں تحریکوں میں کوئی بنیادی اشتراک دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جو نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقیقت کی گہرائیوں میں پہنچتی ہیں، انہیں صاف نظر آجاتا ہے کہ بظاہر اتنی بڑی غیر مانوسیت کے باوجود یہ تحریکیں ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی صدف کی گہر تھیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکی کی جو حالت ہو چکی تھی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ یورپ کے اربابِ حل و عقد نے ترکی کا نام دنیا کے آئندہ شائع ہونے والے نقشہ سے مٹا دیا تھا اور کفن چوروں کی جماعتیں اس لاش کے حصے بخرے کرنے کی فکر کر رہی تھیں کہ اتنے میں مبارز فیض کی کرم گستری سے وہاں ایک ایسا بطلِ جلیل پیدا ہو گیا جسے عقاب کی نگاہیں اور شاہین کے بازو عطا ہوئے تھے۔ اس نے حالات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ترکی کی سکراتِ موت کی ہچکیوں کی ساری ذمہ داری ملوکیت کے سرسام اور مُلّا ازم کے جذام کے سر ہے۔ چنانچہ اس نے قلندرانہ جرأت سے کام لیا اور اپنی ضربِ کاری کے ایک ہی وار سے دونوں بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اس کابوس کے سینے سے اُترنے کے ساتھ ہی قوم کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور رفتہ رفتہ اس میں وہ توانائی پیدا ہو گئی کہ آج سلطنتِ ترکیہ، اقوامِ عالم میں عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ مصطفےٰ کمال کا نام ترکوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر اس مسلمان کے لئے وجۂ صد افتخار ہے جو اپنے دل میں احیائے ملت کا کچھ بھی جذبہ رکھتا ہے۔

مصطفےٰ کمال مفکر نہیں تھا، سپاہی تھا۔ اس لئے اس نے جو کچھ کیا سپاہیانہ انداز سے کیا۔ نیز وہاں کے حالات اس قدر نازک اور وقت اس قدر تنگ تھا کہ اسے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ فکری انداز سے اسلام اور مُلّا ازم کا مطالعہ کر کے اس حقیقت کو پا لیتا کہ اسلام کچھ اور ہے اور مُلّا کا پیش کردہ مذہب کچھ اور۔ نہ ہی وہاں بدقسمتی سے کوئی اور ایسا صاحبِ فکر تھا جو اسے اس میں فرق کر کے بتاتا اور سمجھاتا کہ اسلام ایک متحرک دین ہے جسے مُلّا کے جامد مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ذاتی عقیدہ اور انفرادی تصور ہے مملکت کے معاملات، مملکت کی صوابدید کے مطابق طے ہونے چاہئیں۔ یہ بیشک اس کی غلطی تھی لیکن اس غلطی کا ذمہ دار وہ نہیں تھا۔ اس کے ذمہ دار وہ اربابِ شریعت تھے جنہوں نے اپنے خود ساختہ مذہب کو اسلام کہہ کر پیش کر رکھا تھا اور جو زندگی میں ایک قدم بھی ساتھ چلنے کے قابل نہ تھا۔

جس زمانے میں ترکی میں یہ کچھ ہو رہا تھا عین اسی زمانہ میں سرزمینِ ہند (پاکستان) میں ایک مردِ دانا خالص فکری انداز سے اسی سوال پر غور کر رہا تھا۔ اس نے قرآن، مسلمانوں کی تاریخ، اسلام کے خلاف عجمی سازشوں، اور زمانے کے تقاضوں کا بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور وہ مدتوں کی شب بیداریوں اور اختر شماریوں کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے نکبت و زوال کا باعث ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی لعنت ہے۔ اور جب تک یہ زنجیریں نہیں ٹوٹتیں مسلمانوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب نہیں ہو سکتا اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد، اس مردِ حقیقت بیں نے اپنی زندگی اسی غیر قرآنی مذہب "سلطانی و مُلّائی و پیری" کے خلاف جہاد میں بسر کر دی تا آنکہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں لاہور کی شاہی مسجد کے مینار کے سائے میں آسودۂ خاک ہو گیا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یہ تھیں وہ دو متوازی تحریکیں جو ایک ہی وقت میں ترکی اور ہندوستان (پاکستان) میں عجم کی اس سب سے بڑی سازش (مُلّا ازم) کے خلاف مصروفِ تگ و تاز تھیں، اس فرق کے ساتھ کہ جو کچھ وہاں مصطفےٰ کمال کا ہاتھ سپاہیانہ انداز سے کر رہا تھا، وہی کچھ یہاں اقبال کی زبانِ قلم سے مفکرانہ طریق سے ہو رہا تھا۔ کمال کے پاس قوت تھی لیکن فکر نہ تھا۔ اس لئے اس نے مُلّا ازم کو تو عملاً جڑ سے اکھیڑ دیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے جوشِ انقلاب میں بہت سی غلطیاں بھی کر گیا۔ اقبال کے پاس فکر تھی لیکن قوت نہ تھی اس لئے وہ مُلّا ازم کا عملی استیصال تو نہ کر سکا لیکن مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ گیا کہ مُلّا کا خود ساختہ مذہب

کچھ اور ہے اور اسلام کا دینِ خداوندی کچھ اور۔ مُلّا کے مذہب کو بیشک سیاست سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن اگر سیاست خدا کے دیئے ہوئے دین سے جدا ہو جائے تو وہ چنگیزی بن کر رہ جاتی ہے۔

مصطفےٰ کمال کو ضرورت تھی فکرِ اقبال کی اور اقبال کو ضرورت تھی شمشیرِ مصطفےٰ کمال کی۔ وہاں "قوت تھی بے رائے" اور یہاں "رائے تھی بے قوت"۔ مصطفےٰ کمال کو اپنی زندگی میں یہ قرآنی رائے نہ مل سکی اور اقبال جیتے جی اس قوت کو نہ پا سکا جس کا تصور خود اس نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کی شکل میں دیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال کو غالباً اس کمی کا احساس نہ تھا۔ لیکن اقبالؒ اس حقیقت کو بار بار اجاگر کر رہا تھا کہ اسلام نام ہے قرآنی بصیرت اور فولادی شمشیر کے مجموعہ کا۔ اور

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

کمالؔ اور اقبالؔ اپنا اپنا کام کر کے چلے گئے لیکن "قرآنی بصیرت اور آہنی شمشیر" کا امتزاج کبھی نہ ہو سکا۔ اقبالؒ کے چلے جانے کے بعد، اس کے خوابوں کی عملی تعبیر کبھی مل گئی اور اس کا تصوّر اقبال پاکستان محسوس شکل میں سامنے آگیا۔ لیکن اسے بھی قرآنی بصیرت ابھی تک نصیب نہیں ہو سکی۔ اس اعتبار سے پاکستان کی حالت ترکی سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے۔ اس لئے کہ وہاں کوئی بتانے والا ہی نہ تھا کہ قرآنی فکر کسے کہتے ہیں اور اسلام اور مُلّا کے مذہب میں کیا فرق ہے؟ لیکن پاکستان میں قرآنی بصیرت کا فقدان نہیں۔ باایں ہمہ اس سات آٹھ سال کے عرصہ میں پاکستان نے قرآنی راہ نمائی کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

اس دوران میں پاکستان اور ترکی بھی کچھ دُور دُور سے رہے۔ لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ پاکستان کے اربابِ حل و عقد، ترکی کے انقلاب کا غائر نگاہ سے مطالعہ کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کس طرح مُلّا ازم کے عذاب سے چھڑایا تھا اور اس سے نجات حاصل کرنے سے انہوں نے کیا کیا حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، ترکی کے اربابِ بست و کشاد کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اس قرآنی فکر کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں جو اقبالؒ کے نالۂ سحرگاہی کی بدولت پاکستان کی فضا میں آئینہ باش ہے اور پھر سوچیں کہ اگر وہ ایسے زندہ و پائندہ نظامِ حیات کے تابع زندگی بسر کریں تو اس سے ان کی حالت کیا سے کیا ہو جائے گی۔ اور پاکستان اور ترکی دونوں سوچیں کہ اگر وہ مل کر قرآن کی راہ نمائی میں چلیں تو اقوامِ عالم میں ان کا مقام کیا ہو جائے گا۔

یہ ہماری ہزار خوش بختی ہے کہ ترکی جمہوریہ کے صدر، محترم جلال بایار آج ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے دیدہ و دل ان کے لئے فرشِ راہ ہیں۔ اگر وہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھیں تو انہیں یہ حقیقت بے نقاب نظر آجائے گی کہ مسلمانانِ پاکستان کے دلوں میں ترکوں کی محبت کا جذبہ کس قدر بے پناہ ہے۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم انہیں وہ نقشہ دکھلاتے جب (آج سے قریب تیس سال پہلے) مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھی سمرنا کی پہاڑیوں میں گھرے ہوئے تھے تو ہمارے ہاں کے بوڑھے، جوان اور بچے، صبح کی اذان سے بھی پہلے، تاروں کی چھاؤں میں گلی گلی اور کوچے کوچے پھرتے تھے اور روتے تھے۔ روتے تھے اور جگر خراش نالوں سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے تھے کہ

غازی مصطفےٰ پاشا کمال وے تیریاں دُور بلائیاں

رونڈے سمرنا دے بال وے بیوہ ہو گیاں مائیاں

(غازی مصطفےٰ کمال پاشا! تیری بلائیں دور ہوں۔ سمرنا کے یتیم بچے رو رہے ہیں۔ وہاں کی مائیں بیوہ ہو گئی ہیں)

لیکن یہ بہر حال جذبات کے مظاہرے تھے ان میں شعوری ہم آہنگی کو دخل نہیں تھا۔ اب پاکستان اور ترکی معاہدات کی رو سے قریب آرہے ہیں۔ یہ معاہدات یقیناً شعوری طور پر طے پا رہے ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی محکم تصوراتِ حیات کے اشتراک پر نہیں۔ لہٰذا حقیقی قرب کا باعث نہ وہ مظاہرات ہو سکتے تھے نہ یہ معاہدات ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ فائدے سے نہ وہ خالی تھے نہ یہ خالی ہیں۔ حقیقی قرب قلب و نگاہ کی ہم آہنگی اور نظام کی وحدت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور مسلمان مملکتوں میں ہم آہنگی اور وحدت کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ دونوں میں قرآنی نظام رائج ہو جائے۔ اگر ہمارے یہ محترم مہمان اس نگاہ سے اس قرآنی فکر کا مطالعہ کریں جو پاکستان کی فضا میں پھیل رہا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ انہیں اس میں وہ متاعِ عزیز مل جائے گی جس کی مصطفےٰ کمال کے زمانہ میں ترکی کو تلاش تھی اور جس کے نہ ہونے سے وہاں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ دوسری طرف اگر پاکستان کے اربابِ بست و کشاد اپنے ہاں قرآنی نظام کو رائج کرنے کا فیصلہ کر لیں تو اس سے پاکستان اور ترکی میں ایک ایسی وحدت پیدا ہو جائے گی جو کسی کے توڑنے سے نہیں ٹوٹ سکے گی۔

خدا کرے کہ پاکستان اور ترکی کا یہ سیاسی قرب ان کے حقیقی قرب کا باعث بن جائے اور اس طرح اقبالؒ کی یہ دیرینہ پیش گوئی پوری ہو جائے کہ

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

بوئے گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

سندھ کی جاگیرداری

نوعِ انسانی کی تاریخ میں وہ دن کتنی بڑی بدبختی کا تھا جب فرزندِ آدم نے پہلے پہل زمین کے ایک حصے پر لکیر کھینچی اور کہدیا کہ یہ میری ملکیت ہے اس کی پیداوار میں کسی اور کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اس نے ان تمام فساد انگیزیوں اور ناہمواریوں کا بیج بو دیا جن سے انسانی معاشرہ جہنم بن کر رہ گیا۔ پھر اس سے بھی بدبخت تھا وہ دن جب کسی نے یہ کہا کہ میری اس ذاتی ملکیت کو خدائی سند حاصل ہے اور اس طرح اپنی مفاد پرستیوں اور خون آشامیوں میں "خدا" کو بھی برابر کا حصہ دار بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ بار بار اپنے رسول بھیجتا رہا اور ان کی وساطت سے انسانوں تک یہ پیغام پہنچاتا رہا کہ ہم نے رزق کے یہ سرچشمے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے پیدا کئے ہیں۔ انہیں تمام انسانوں کی ضروریات کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۴۱/۱۰)۔ مفاد پرست گروہ نے ہمیشہ اس فیصلے سے اعراض برتا اور ہر شخص اپنی اپنی طاقت کے مطابق ان وسائلِ پیداوار کو اپنی ملکیت میں لیتا اور کمزور انسانوں کو ان سے محروم کرتا چلا گیا تاکہ وہ (رزق کی خاطر) اس کی غلامی اختیار کر لیں۔ لیکن خدا نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اگر تم ہمارے اس فیصلے سے منہ موڑتے ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم بے بس ہو کر بیٹھ جائیں گے اور تم اپنی من مانی کرتے چلے جاؤ گے۔ اس نے کہا کہ ہمارا ایک کائناتی قانون ہے (جسے تم اپنے تصور کے مطابق "زمانے کے تقاضے" کہتے ہو) جو تمہیں بتدریج آہستہ آہستہ، مار مار کر اسی فیصلے کی طرف لے آئے گا۔ اور اس طرح آخر الامر تمہیں وہی نظام اختیار کرنا پڑے گا جس میں رزق کے سرچشمے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں۔ اس نے کہا کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (۱۳/۴۱)۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے معاشی ذرائع (ارض) کو چھین کر ان کی ذاتی ملکیتوں کی حدود کو کم کرتے چلے جا رہے ہیں اور اس طرح دکھا رہے ہیں کہ جو فیصلہ ہم نے کیا تھا اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (۱۳/۴۱)

خدا کے فیصلوں کی طرف آنے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں ایک وحی کی راہ نمائی میں اور دوسرے زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر۔ پہلے طریقے میں انسان بغیر کسی تباہی اور بربادی کے منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ لیکن دوسرے طریق سے (جو عقل کا تجرباتی طریقہ ہے) وہ ٹھوکریں کھاتا اور ٹھپیڑے کھاتا وہاں تک آتا ہے۔ اقوامِ مغرب اس دوسرے راستے سے خدائی فیصلوں کی طرف آتی چلی آرہی ہیں۔ مسلمان کو اللہ نے وحی کے ذریعے اس طرف آنے کو کہا تھا۔ اس نے وحی کو بھی چھوڑا، اور عقل و فکر کو بھی۔ اس لئے وحی کا طریقہ تو ایک طرف) وہ تجرباتی طریقہ سے بھی اللہ کے فیصلوں کی طرف آنے میں سب سے پیچھے ہے۔ باایں ہمہ (بعد از خرابیٔ بسیار ہی سہی) اسے طوعاً و کرہاً اس طرف آنا ہی پڑتا ہے اس کے سوا چارہ ہی نہیں۔

ان "سب سے پیچھے رہنے والوں" میں سے جس کسی کا کوئی قدم اس صحیح راستے کی طرف اُٹھتا ہے وہ ہمارے نزدیک درخورِ تحسین ہوتا ہے۔ اس قسم کا ایک قدم ہے جو حکومتِ سندھ کی طرف سے اٹھایا گیا ہے اور جس کی رُو سے اس صوبہ میں جاگیرداری کی لعنت کو منسوخ قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حکومت کی طرف سے جو اعلان شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اس فیصلہ سے ایک تو یہ ہوگا کہ قریب گیارہ لاکھ ایکڑ زمین کا لگان حکومت کو وصول ہو جائے گا (کیونکہ جاگیرداری میں زمین کا لگان بھی معاف ہوتا ہے) اور دوسرے یہ کہ جن جاگیرداروں کے حقوقِ زمینداری ثابت نہ ہوں گے ان کی اراضی، حارثین (کاشتکاروں) کو دیدی جائیں گی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ

اس طرح کس قدر اراضی حارثین کے حصے میں آئے گی لیکن سندھ کے وزیر مالیات، پیر علی محمد راشدی کے ایک بیان کے مطابق زیادہ نہیں تو کم از کم پانچ لاکھ ایکڑ اراضی یقیناً غریب کاشتکاروں میں تقسیم ہو جائے گی۔ بہر حال ایں ہم غنیمت است۔ ہم حکومت سندھ کو ان کے اس مستحسن اقدام پر مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی خدمت میں بتاکید گذارش کرتے ہیں کہ اس فیصلہ کو جلد از جلد عمل میں لایا جائے۔ اس باب میں وہ کسی مخالفت کی پرواہ نہ کریں۔

اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

> دس لاکھ کاشتکار ایسے ہیں جو ایک سو چھبیس جاگیرداروں کے رحم و کرم پر حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے خون پسینے کی کمائی سے جاگیرداروں کی دولت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بعض مقامات میں جاگیردار اپنے آپ کو قانون سے بھی بالا سمجھتے ہیں اور غریب کاشتکاروں کی بیویوں اور بیٹیوں تک کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔ کئی جاگیریں دو دو لاکھ ایکڑ زمین پر مشتمل ہیں۔

لیکن جو کچھ جاگیرداروں کے متعلق کہا گیا ہے وہ انہی سے مخصوص نہیں۔ ہر بڑے زمیندار کی یہی حالت ہے۔ اگر سندھ میں چھیالیس جاگیردار ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس پانچ پانچ ہزار ایکڑ زمین ہے تو اس سندھ میں دو سو چھیالیس زمیندار ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس اتنی اتنی ہی زمین ہے۔ کاشتکاروں کے ساتھ جو کچھ جاگیردار کرتے ہیں ایسا کچھ زمیندار بھی کرتے ہیں لہٰذا جن انسانیت سوز وجوہات کی بنا پر جاگیرداری اس قابل قرار پائی ہے کہ اسے منسوخ کیا جائے انہی وجوہات کی بنا پر زمینداری بھی اس قابل ٹھہرتی ہے کہ اسے ایک دن کے لئے باقی نہ رکھا جائے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ راشدی صاحب کو اس حقیقت کا احساس ہے اور وہ بھی ذاتی طور پر زمینداری کی تنسیخ کے حق میں ہیں۔ انہوں نے جو کہا ہے کہ یہ مسئلہ درحقیقت آل پاکستان بنیادوں پر حل کرنے کے قابل ہے، ہم اس سے متفق ہیں ہم پاکستان کے ارباب حل و عقد سے باادب درخواست کریں گے کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو محسوس کریں اور ان خلاف انسانیت معاشی ناہمواریوں کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کریں جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مملکت پاکستان میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ہمیں خطرہ ہے کہ کمیونزم کا بڑھتا ہوا سیلاب امنڈ کر آ جائے گا اور جس سے ساری قوم جہنم کے بھیانک غاروں میں جا گرے گی۔ فہل من مدکر۔

کوائفِ پاکستان

وحدت مغربی پاکستان کا کام سرعت تمام جاری ہے۔ اب توقع یہ ہے کہ ۲۸ فروری تک انتظامی کونسل اپنی رپورٹ مکمل کر کے مرکزی حکومت کو پیش کردے گی۔ لاہور میں گزشتہ ہفتے جو کونسل کا جو اجلاس ہوا اس میں سکریٹریٹ اور عملہ سے متعلق کمیٹی نے اپنی رپورٹ مکمل کر دی۔ یہ کمیٹی دسمبر کے اواخر سے شبانہ روز کام کرتی چلی آرہی ہے۔ جو کمیٹی ملازمتوں کو مخلوط بنانے کے لئے مقرر کی گئی تھی وہ اپنی رپورٹ اسی ہفتے میں پیش کردے گی۔ وزیر اعظم نے لندن سے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہو سکتا ہے مغربی پاکستانی صوبہ جون کے اواخر تک معرض وجود میں آجائے۔

اسی بیان میں وزیر اعظم صاحب نے کہا کہ پاکستان کا دستور قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ اسے جلد سے جلد مکمل کر کے تمام صوبوں کے ایک نمایندہ کنونشن کے پیش کیا جائے۔ انہوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ملک میں پارلیمانی حکومت کو جلدی بحال ہونا چاہیئے۔ اسی لئے انہوں نے بتایا کہ کوشش کی جارہی ہے کہ مغربی پاکستان کی وحدت سرعت سے طے ہو جائے۔

مغربی وحدت اور آئین سازی کا کام عمدگی اور تیز رفتاری سے سرانجام پا رہا تھا کہ سندھ چیف کورٹ کا وہ فیصلہ سامنے آگیا جس کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ گورنر جنرل مجلس دستور ساز کو توڑنے کے مجاز نہیں تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آئین سازی پر کیا اثر پڑیگا فی الحال تو صورت یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے فیڈرل کورٹ میں اپیل کی جارہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک فیڈرل کورٹ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا موجودہ صورت برقرار رہے گی۔ اس کے بعد فیصلہ کے مطابق کارروائی کرنا ہوگی۔ جنرل اسکندر مرزا نے فیصلہ کے بعد جو بیان دیا وہ بالکل واضح ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس فیصلے سے لوگوں کے دلوں میں یہ شک نہیں پیدا ہونا چاہیئے کہ وحدت مغرب یا آئین دستور کے کام رک جائیں گے۔ یہ ضروری کام تو بہر حال ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت امن و امان برقرار رکھنے پر پوری طرح مستعد ہے لہٰذا کسی قسم کی گڑبڑ برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس بیان سے پتہ چلتا تھا کہ وحدت اور آئین سے متعلق کام میں کچھ تاخیر نہیں روا رکھی جائے گی اور جوں جوں فیصلے ہوں گے ان پر مناسب طریق سے عمل درآمد شروع کر دیا جائے گا۔

تذبذب

اس کے مقابلے میں وزیر اعظم کے بیان سے کچھ تذبذب کے آثار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے لندن سے واپسی پر کراچی کے ہوائی اڈے پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت وحدت اور آئین سے متعلق ملک بھر میں جو عمومی اتفاق پایا جاتا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ قوم کو ہر دو معاملات میں حکومت کے عزائم و مقاصد اور طریق کار پر پورا اعتماد ہے اور وہ مجلس دستور ساز کو اپنا نمائندہ نہیں سمجھتی۔ لہٰذا اس کام کی رفتار کو کسی طور کم نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ پہلے ہی اس میں برسوں کی تاخیر ہو چکی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے جنرل اسکندر مرزا کے بیان کی تائید کی اور کہا کہ جب تک عدالت کا فیصلہ سامنے نہیں آجاتا حکومت کا کاروبار جاری رہے گا۔ آئین سے متعلق آپ نے کہا کہ وہ پارلیمانی ہوگا۔ اس میں امریکی آئین کے اچھے اصول ہوں گے اور کابینہ مقننہ کے سامنے جوابدہ ہوگی۔

وزیر اعظم کراچی آتے ہوئے راستے میں پیرس میں گورنر جنرل غلام محمد صاحب، سے بھی مل کر آئے ہیں۔ گورنر جنرل خود اسی ہفتے میں ترکی کے صدر، جناب جلال بایار کی آمد سے پہلے پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ مسٹر محمد علی کراچی پہنچ کر عازم ڈھاکہ ہو گئے۔ ان کا یوں اچانک ڈھاکے جانا خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سفر ذاتی امور کے سلسلہ میں بھی ہے اور اس مقصد کے پیش نظر بھی کہ وہ وہاں کی صورت حال کو بچشم خود دیکھیں۔ لندن جانے سے پیشتر انہوں نے بتایا تھا کہ جب تک وہ حالات کا خود معائنہ نہیں کرلیں گے مشرقی پاکستان میں پارلیمانی بحالی کے لئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ سفر واقعی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ویسے ان دنوں مشرقی پاکستان میں سیاسی سرگرمی بڑھ رہی ہے۔ ان دنوں صوبائی مسلم لیگ کونسل نے اپنا اجلاس منعقد کیا ہے اور نئے صدر کا انتخاب کیا ہے۔ مسٹر نور الامین کا استعفیٰ منظور کر کے ان کے بجائے مولانا اکرام خاں کو صدر منتخب کیا گیا ہے اور مسٹر ابوالقاسم کو نائب صدر۔ کونسل نے مسٹر محمد علی سے مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ وہ بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں اس لئے وہ مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو جائیں۔ کونسل نے پاکستان مسلم لیگ سے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ وہ پاکستان کونسل کا اجلاس جلدی طلب کریں تاکہ اہم ملی مسائل مسلم لیگ کا احیا اور استحکام اور وحدت مغرب سے متعلق غور و خوض کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ ایک یونٹ کی تجویز کو منظور کر چکی ہے۔ جہاں تک اس کے احیا و استحکام کا تعلق ہے اس کے لئے ایک کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن کنونشن کی تاریخیں تین چار مرتبہ بدلی جا چکی ہیں۔ کنونشن کا خیال اب بھی ترک نہیں کیا گیا۔ وہ کب منعقد ہو سکے گا اور کیا فیصلے کرے گا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

متحدہ محاذ

ڈھاکہ میں ۱۷ر فروری کو متحدہ محاذ کا جلسہ بھی ہو رہا ہے جس میں پارٹی لیڈر مولوی فضل الحق کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش

(باقی کالم ایک کے نیچے)

ہو رہی ہے۔ تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی فضل الحق نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ پارٹی کی قیادت سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اگر انہوں نے واقعی ایسا اعلان کیا ہے اور وہ اس اعلان پر قائم رہے تو دفعہ ۹۲ — الف کے خاتمے کا امکان بڑھ جائے گا۔

عالم اسلامی

قاہرہ میں مصر نے عرب وزرائے اعظم کی کانفرنس کا جو ڈھونگ رچایا تھا وہ ختم ہوگیا ہے۔ یہ کانفرنس بظاہر اس مقصد کے لئے منعقد کی گئی تھی کہ ممالک عربیہ کو متحد رکھا جائے اور مشترکہ حکمت عملی پر کاربند۔ مگر اس کے نتائج پر غور کیا جائے تو اس نے بالکل اُلٹا کام کیا ہے۔ عرب ممالک جو ایک حد تک عرب لیگ کے تحت متحد سے ہوتے جارہے تھے اب تین ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طرف عراق ہے جو ترکی سے معاہدہ کرنے پر مصر ہے، دوسری طرف شام، لبنان، اردن اور لیبیا ہیں جو ان معاہدوں کے مخالف نہیں۔ تیسری طرف مصر اور سعودی عرب ہیں جو مخالفت کے علمبردار ہیں۔

قاہرہ کانفرنس کی ناکامی سے جھنجلا کر مصر نے دوسرے گروہ کے ممالک کے خلاف غیر ذمہ دارانہ پروپیگنڈا شروع کردیا ہے۔ اس مہم میں مصری ریڈیو بھی شریک ہے۔ مصری وزیر بھی اور سرکاری اخبارات بھی۔ جن وزرائے اعظم نے مصر کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی، انہیں مصر کے وزیر کرنل انور سادات نے سرکاری اخبار "الجمہوریہ" میں غدار تک کہہ دیا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر "ایک وزیر اعظم" کی طرف اشارہ کیا "جس کی سازش کی بدبو سے ساری فضا متعفن ہوگئی ہے"۔ کرنل صاحب نے عربی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مشکلات جہالت یا غربت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسی سازشوں کی بدولت ہیں جو ہر عرب ملک میں ہورہی ہیں۔ "ہم نے مصر میں انہیں ختم کردیا ہے"۔ لہٰذا وہ عراقی عوام اٹھیں جنہوں نے ۱۹۴۱ء میں اس وقت کے وزیر اعظم کے خلاف عراق برطانوی تسلط کے سلسلہ میں بغاوت کردی تھی۔ وہ شامی اور لبنانی عوام بھی اٹھیں جنہوں نے جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی تسلط کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس پروپیگنڈہ سے مصر کی بوکھلاہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ مخالفت میں اس قدر غلو کررہا ہے کہ یہ بھی بھول رہا ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے عوام کو ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ انداز گفتگو جنگ کے دوران میں تو قابل فہم ہوسکتا ہے لیکن ان ملکوں کے معاملہ میں اس کا کوئی جواز نہیں جن سے جنگ نہیں ہورہی ہے بلکہ جنہیں اپنے نقطہ نگاہ کا قائل کرانا مقصود ہو۔ عراق نے بجا طور پر اس طوفان بدتمیزی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ عراق کے قائم مقام وزیر خارجہ شاکر الوادی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ مصر اشتہارات اور پمفلٹ بھیج بھیج کر عراقیوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کررہا ہے۔ انہوں نے مصری سفیر کو بلا کر یہ بھی کہا کہ مصر ایسے اشتہارات سفارتی تھیلوں میں سامنے لٹریچر کا نام دے کر لا رہا ہے۔

مصر کا رویّہ

مصر نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جس دن عراق نے ترکی سے معاہدہ کرلیا، اسی دن وہ عرب لیگ کے دفاعی معاہدہ سے علیحدہ ہو جائے گا۔ علیحدگی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس معاہدے کو کالعدم سمجھے گا بلکہ اس کی بجائے وہ ایک نئی دفاعی تنظیم تشکیل کرے گا۔ اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ عراق کو اس دفاعی معاہدے سے نکال دیا جائے گا اور دوسرے یہ کہ مصر اپنی قیادت برقرار رکھنے کے لئے دوسرا معاہدہ مرتب کرے گا۔ دیکھا جائے تو موجودہ معاہدہ بھی بے معنی ہے کیونکہ اس پر کسی قسم کا عمل درآمد نہیں ہوسکا اور نہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ عرب لیگ ممالک اپنی کمزوری، نااتفاقی اور باہمی کشمکش کی وجہ سے، اسے قابل عمل اور موثر تنظیم بنا سکیں گے۔ البتہ جب تک یہ کاغذی تنظیم موجود ہے، مصر کو اسے استعمال کرکے دوسرے ممالک کو اپنے زیر اثر رکھنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر ایک ایسی متبادل تنظیم سوچ رہا ہے جو پوری طرح اس کے تسلط میں ہو۔ اگر ایسی کاغذی ناؤ بنا بھی دی گئی تو اس سے عربی کشمکش اور ابھر کر سامنے آئے گی، استحکام ہونے کی صورت یقیناً نہیں پیدا ہوگی۔ اور اس کی ذمہ داری مصر پر ہوگی۔

مصر کو تقویت سعودی عرب سے مل رہی ہے جس کی رقابت عراق اور اردن سے دیرینہ ہے۔ وہ مصر کا مؤید ہے تو اسی وجہ سے کہ وہ نہیں چاہتا کہ ہاشمی خاندان جسے ابن سعود نے عرب سے بے دخل کیا تھا، کسی طرح طاقتور ہوجائے۔ شاہ سعود نے ایک بیان میں کہا ہے کہ عرب لیگ دم توڑ رہی ہے کیونکہ بعض عرب ممالک نے مشترکہ لائحہ عمل سے انحراف کیا اور دوسرے انہیں اس انحراف سے باز نہ رکھ سکے۔ شاہ سعود نے کسی ملک کا نام نہیں لیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کا روئے سخن عراق کی طرف بالخصوص ہے۔ عموماً اس سے وہ ممالک بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے مصر اور سعودی عرب کا ساتھ نہیں دیا۔ اس بیان میں انہوں نے غیر ملکی معاہدات کی بھی مخالفت کی۔ ان کے وزیر اعظم شہزادہ فیصل نے کہا ہے کہ اگر مصر نے عرب لیگ کے مشترکہ دفاعی معاہدے سے علیحدگی اختیار کی تو سعودی عرب بھی اس معاہدے کو چھوڑ دے گا۔ لیکن یہ دیکھنا ہے کہ وہ دونوں مل کر کن ممالک کو ساتھ رکھ سکیں گے اور اگر بعض یا سب کو ساتھ ملا بھی لیں تو اس تنظیم سے عربی علاقوں کا تحفظ کیسے ہوسکے گا۔

ہندوستان سے مشورہ

مصر کے روابط ہندوستان سے دیرینہ ہیں اور ہندوستان مصر کو اکثر اکساتا رہتا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں نہ پاکستان کا دخل بڑھنے دے نہ وہ کسی مشترکہ دفاعی تنظیم کو معرض وجود میں آنے دے۔ پنڈت نہرو نے لندن کانفرنس میں بھی علاقائی تنظیموں کی مخالفت کی وہ پاک ترکی معاہدے کی بھی مخالفت ہیں اور ترکی عراقی معاہدے کے بھی۔ چنانچہ ان دنوں مصری وزیر اعظم کرنل ناصر خاص طور پر پنڈت نہرو سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ پنڈت نہرو کو لندن سے واپسی پر قاہرہ رکنا ہے۔ کرنل ناصر کی کوشش یہ ہے کہ انہیں کچھ دیر اور ٹھہرا لیا جائے اور ان کے ذریعہ عربی ممالک کو علاقائی معاہدوں سے باز رکھا جائے۔ پنڈت نہرو اس سلسلہ میں جو کرنا چاہیں گے یا کرسکتے ہیں اس کا تصور مشکل نہیں لیکن یہ محل نظر ہے کہ ناصر اور نہرو عراق کو ترکی سے معاہدہ کرنے سے روک سکیں گے بلکہ ان کوششوں سے تو عراق عزم اور مستحکم ہوگیا ہے۔ پختہ وعدے سے کہا جارہا ہے کہ معاہدہ ہوکے رہے گا۔ ترکی کے صدر جناب جلال بایار، اور وزیر اعظم جناب عدنان مندریز، بغداد جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ صدر ترکی پاکستان کے دورے کے بعد عراق جائیں۔ ان کے عراق جانے تک جملہ انتظامات مکمل ہوچکے ہوں گے اور ترکی عراقی معاہدے پر دستخط ہوجائیں گے۔

مغرب کی طرف میلان

جو ممالک عربیہ درمیانی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا طریق کار اختیار کریں گے۔ وہ مغرب سے مفاہمت کے حق میں ہیں اور غالباً اس سے معاہدات کرلینے پر بھی انہیں چنداں اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ان کی کوشش یہ ہے کہ وحدت عربیہ کو صدمہ نہ پہنچے۔ چنانچہ وہ ان ہی دو مقاصد میں توازن پیدا کررہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مصر اور سعودی عرب نے جو غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرلیا ہے اور جس سے جس حد تک عربی وحدت پارہ پارہ ہورہی ہے، اس کے پیش نظر وہ بالآخر عراق کی طرف جھک جائیں۔ اس کے آثار ایک حد تک لبنان کی ایک تجویز سے ملتے ہیں۔ پارلیمانی مجلس روابط خارجہ نے حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ ترکی سے معاہدہ کیا جائے اور اس طرح بالواسطہ مغرب سے تعلق پیدا کیا جائے، ترکی کو چھوڑ کر براہ راست مغرب سے معاہدہ کرنا چاہیئے تاکہ بیرونی حملوں سے مدافعت کے انتظامات ہوسکیں۔ ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس تجویز کا کیا انجام ہوگا۔ لیکن اس سے سوچنے کا رخ ایک خاص سمت کی طرف ضرور ہوگیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممالک عربیہ میں بیرونی حملے کا خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حملے کا خطرہ اشتراکیت کی طرف سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور جیسا کہ سابقہ تبصرے میں آچکا ہے، اشتراکیت نے ابھی ان ممالک کو خصوصی توجہ کا مرکز بنانا شروع کردیا ہے جوں جوں اس خطرے کا احساس بڑھتا جائے گا مغرب کی طرف میلان بھی زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس سے اس وقت نہ سہی، بعد میں ضرور ترکی سے اتحاد ناگزیر ہو جائے گا۔

ترکی کی اہمیت

مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں اب ترکی کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ وہ ایک طرف پاکستان سے معاہدہ کرچکا ہے، دوسری طرف عراق سے معاہدہ کررہا ہے۔ انقرہ سے کراچی تک کا سلسلہ صرف طہران کی کڑی مل جانے سے پورا ہوجاتا ہے۔ اور یہ کڑی اب گمشدہ نہیں رہی۔ ایران زود یا بدیر اس سلسلۂ دفاع میں شریک ہوجائے گا۔ اس کا صحیح اندازہ شاہ ایران کے واپس وطن آنے کے بعد لگایا جاسکے گا۔ شاہ موصوف امریکہ کا دورہ ختم کرچکے ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے قائدین امریکہ سے مشرق وسطیٰ کے دفاع پر تفصیلی گفتگوئیں کرلی ہیں۔ ان کے قریبی حلقوں سے متعدد مرتبہ یہ اطلاعیں آچکی ہیں کہ وہ مشرق وسطیٰ کے معاہدۂ دفاع میں شریک ہوجائیں گے۔ امریکہ سے واپس ہوتے ہوئے وہ ہفتہ عشرہ کے لئے انگلستان ٹھہریں گے۔ اور وہاں قائدین برطانیہ سے اس سلسلے میں مزید گفتگو کریں گے۔ ایران کو ترکی اور عراق نے اپنے معاہدے میں شرکت کی دعوت بھی دی ہے۔ گویا ایران کو شامل کرنے کی باقاعدہ کوشش شروع کردی گئی ہے۔ ایران اس معاہدہ میں شامل ہوجائے گا تو مشرق وسطیٰ کا شمالی حصہ دفاعی تنظیم میں منسلک ہوجائے گا۔ یہ سلسلہ ایک دفاعی ہلال کی شکل میں قسطنطنیہ سے کراچی تک اشتراکیت کی راہ میں حائل ہوگا۔

تاریخی شواہد

(۳)

سورۂ ہود میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَنْ
لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝
فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا
مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ
الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ
(۱۱/۲۵-۲۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) میں تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی محکومیت و اطاعت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کی راہ اختیار کی تھی کہا۔ ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں پست درجے کے ہیں۔ اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

سورۂ مومنین میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ
مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۲۳/۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا "لوگو! صرف اللہ ہی کی اطاعت و محکومیت اختیار کرو۔ تمہارا اور کوئی حاکم نہیں ہے۔ کیا اس کے قوانین کی نگہداشت نہیں کروگے؟"

یہ دعوتِ نوحؑ کا اولین اور اساسی اصول تھا۔ یعنی خدا کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اس کے مرکز کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (۲۶/۱۰۷-۱۰۸)

میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا (حکومتِ الٰہیہ کا) امانتدار ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری (بہ حیثیت مرکز اس کی) اطاعت کرو۔

سورۂ نوح میں ہے۔

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ (۷۱/۳)

پس اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور میری اطاعت کرو۔

دعوتِ نوحؑ کی تعلیم کے ان عناصر پر بھی غور فرمائیے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو ان کی قوم کے آباء و اجداد (اسلاف) سے متوارث چلا آتا تھا اور ان کے اربابِ ثروت و حکومت کے تغلب و اقتدار کے خلاف بے خوف و خطر بغاوت! تاریخِ انسانیت کے اوراق کو الٹتے جائیے۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں۔ معتقدات، خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آباؤ اجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو ان کے نزدیک ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھننے سے اس کی ساری کائنات لٹ رہی ہے۔ لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپِ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے آباء سے وراثتاً ملے ہوں، یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں فنا کر دیا جائے۔ تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحی مبین کی شکل میں انسانی رشد و ہدایت کے لئے ملتی ہے۔ اپنے ذاتی خیالات و تصورات کو بھی اسی کی روشنی میں پرکھئے۔ اور ان معتقدات کو بھی جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہوں۔ لیکن انسان کی اس شوریدہ بختی کو کیا کیجئے کہ وہ ہر پرانی (قدیم) چیز کو تقدس کا لبادہ اڑھا دیتا اور اسے تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن کریم نے جب سب سے پہلی دعوتِ حق و صداقت کا ذکر کیا تو اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ صداقت کے قبول کرنے میں سب سے پہلے کونسا جذبہ مانع ہوتا ہے، یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ، کورانہ تقلید کا مسلک۔ آپ دیکھیں گے کہ حضرت نوحؑ سے لیکر حضور خاتم النبیینؐ تک ہر داعیِ حق و صداقت کی آواز کے جواب میں یہی کچھ کہا جاتا رہا کہ چونکہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے آباء و اجداد کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ
لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ
أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ
آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝ (۱۴/۱۰)

ان کے رسولوں نے کہا، کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمہیں بلا رہا ہے کہ تمہارے لئے سامانِ حفاظت پیدا کر دے، اور ایک مقررہ وقت تک (زندگی و کامرانی کی) مہلتیں دے۔" اس پر قوموں نے کہا، "تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور چاہتے ہو کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں، ان کی پوجا کرنے سے ہمیں روک دو۔ اچھا (اگر ایسا ہی ہے تو) کوئی واضح دلیل پیش کرو۔"

اور اسے چودہ سو سال پیشتر تک ہی محدود کیوں رکھئے! کیا آج بھی جب یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ! اپنے معتقدات و تصوراتِ حیات کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں تو اس کے جواب میں کیا وہی پرانی آواز نہیں دہرائی جاتی کہ ہم اسی چیز کو حق سمجھتے ہیں جو اسلاف سے منتقل ہو کر چلی آرہی ہے اور اس کے خلاف جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں؟ زمانے کے تغیرات سے صرف پیکر بدلا کرتے ہیں۔ روح تو وہی چلی آتی ہے۔ حق و صداقت کی روح بھی ایک ہی ہے اور اس کے مقابل میں باطل کی طاغوتی روح بھی ایک ہی۔

اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں، نشۂ حکومت و سطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ یہ صید و صیاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتوان انسان زبردست اور قوی انسانوں کے پنجۂ تغلب و تسلط میں تڑپتے، پھڑکتے، سسکتے، بلبلاتے سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دیں گے۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور اور ناتوان انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں چھوڑ دیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان اور خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت و تسلط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی ابلیسانہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دامِ تغلب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم نہایت اہم و ضروری ہے۔ قرآن کریم نے جس دعوت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس تصادم کا ذکر بھی کیا ہے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ مجلد۔ گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت چار روپے [بنام ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس ۴۳۱۳ کراچی

اسلام کی سرگذشت

(۳)

بہرحال نسب نگاروں کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے اس کی نقل و حرکت قبائل کے درمیان اکثر ہوتی رہتی تھی۔

عدنانیوں اور قحطانیوں کے درمیان پرانے زمانے سے عداوت مستحکم چلی آتی تھی حتیٰ کہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ ہر قوم نے اپنے لئے جنگ میں خاص شعار مقرر کر رکھے تھے جو دوسری قوم کے شعاروں سے مختلف ہوتے تھے۔ چنانچہ مضریوں نے سرخ عمامے اور سرخ جھنڈے کو اپنا شعار بنایا تھا تو اہل یمن نے زرد عمامے۔ جوہری کہتے ہیں کہ میں نے ایک عالم کو ابو تمام کے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے سنا جس میں وہ موسم بہار کی تعریف کر رہا ہے۔

مُحْمَرَّةٌ مُصْفَرَّةٌ فَكَأَنَّمَا عُصَبٌ تَيَمَّنَّ فِي الْوَغَى وَتَمَضَّرُ

(سرخ اور زرد پھول کھلے ہوئے ہیں گویا کہ وہ عمامے ہیں جو جنگ میں لوگوں کو یمنی اور مضری ظاہر کرتے ہیں)

اس دشمنی اور عداوت کی بنیاد بظاہر بداوت اور حضارت کی طبعی نزاع ہے پے در پے جنگی حادثات و وقائع اس عداوت کو بڑھاتے اور شر کی روح کو ان کے درمیان قوی کرتے چلے گئے۔ اس شدید عداوت کی واضح ترین مثال وہ عداوت ہے جو اہل مدینہ (اوس و خزرج) ــــ جو نسب نگاروں کے بیان کے مطابق یمنی ہیں ــــ اور اہل مکہ ــــ جو عدنانی ہیں ــــ کے درمیان تھی۔ یہ مقابلہ ان کے درمیان اسلام کے بعد بھی جاری رہا۔ دونوں قوموں کے درمیان چپقلش اور منافرت جاری رہتی تھی۔ ہر فریق دعویدار تھا کہ وہ نسب کے اعتبار سے زیادہ شریف اور رجعیت کے لحاظ سے زیادہ معزز ہے۔ یمنی اگر فخر کرنے میں زیادہ حق بجانب تھے کیونکہ وہ ایک پرانی تہذیب کے علم بردار اور مستحکم حکومت کے مالک تھے۔ جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جو عدنانی تھے اور خلافت بھی قریش میں قائم ہو گئی جو عدنانی تھے تو عدنانیوں کا پلڑا جھک گیا۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اہل یمن فضل و شرف میں توازن قائم کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے اور اس کے لئے انہوں نے ہر طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ ان کے رواۃ اور قصہ گو لوگوں نے ان کی قدیم تاریخ کو نہایت شاندار اور حسین رنگ دینے کی کوششیں کیں اور بتایا کہ قحطان ہود علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ کچھ لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنا نسب عدنانیوں کے ساتھ ملانے کی کوشش کی چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ اسماعیل علیہ السلام ہی تمام عربوں کے باپ ہیں حتیٰ کہ قحطان کے بھی۔ اکثر اوقات یہی لوگ عربوں کی تقسیم کے نظریہ کے بانی بھی رہے ہیں چنانچہ عرب بائدہ میں وہ قحطان، عاد، ثمود اور طسم وغیرہ کو شمار کرتے ہیں اور انہی کو العرب العربا یا العرب العاربہ کے نام سے وہ یاد کرتے ہیں اور عدنانیوں کو عربیت کے دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں چنانچہ ان کو عرب متعربہ کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے عربوں کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ ایک تو عرب عاربہ ہیں یہ عاد، ثمود اور طسم وغیرہ ہیں۔ دوسرے عرب متعربہ ہیں اور یہ قحطان ہیں اور تیسرے عرب مستعربہ ہیں اور یہ عدنان ہیں یعنی اس طرح انہوں نے عدنانیوں کو عربیت کے تیسرے درجہ میں پھینک دیا ہے۔

یہ نسب نگار مسلسل کہتے چلے آ رہے ہیں کہ قحطان تمام اہل یمن کے باپ تھے اور ان کی نسل دو بڑی شاخوں میں پھٹ گئی۔ ایک کہلان کی شاخ ہے اور دوسری حمیر کی۔ کہلان کی پھر بہت سی شاخیں ہو گئیں جن میں سے مشہور ترین یہ ہیں:۔

(۱) طئی:۔ جو دو مشہور پہاڑوں اجا اور سلمیٰ پر رہتی تھیں۔ یہ دونوں آج تو شمر کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ قوم طئی ان دونوں پہاڑوں پر اسلام سے صدیوں پہلے سے رہتی چلی آتی تھیں۔ ان کی شہرت آفاق گیر تھی حتیٰ کہ سریانی اور ایرانی لوگ تمام عربوں ہی کو طئی کہنے لگے تھے۔

(۲) ہمدان و مذحج:۔ زیادہ تر یمن کے باشندے تھے۔ بنو حارث جو طائف کے جنوب شرق میں رہتے تھے اور بجیلہ جس کے اثرات عہد فاروقی میں عراق کی فتوحات میں نمایاں ملتے ہیں، اسی مذحج کی طرف منسوب ہیں۔

(۳) عاملہ اور جذام:۔ بحر شام میں رہتے تھے۔ لخم جس نے فرات پر مملکت حیرہ کی بنیاد رکھی تھی اور کندہ جس نے حضرموت میں حکومت قائم کی اور جس کی سلطنت یمامہ میں نجد تک پھیل گئی تھی اسی جذام کی طرف منسوب ہیں۔ کندہ کے شاہی خاندان ہی کی طرف امرؤ القیس کی نسبت کی جاتی ہے۔

(۴) ازد:۔ یہ بڑا پر شوکت قبیلہ تھا جس نے عمان میں حکومت قائم کی۔ انہی میں سے وہ غسانی قبیلہ ہے جنہوں نے شام کے مشرق میں اپنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ انہی میں سے خزاعہ کا وہ قبیلہ تھا جو قریش سے پہلے مکہ پر متسلط ہو گیا تھا اور انہی میں سے یثرب کے باشندے یعنی اوس اور خزرج کے دونوں قبیلے تھے۔

اس کے بعد حمیر کی شاخ کے مشہور ترین قبائل یہ ہیں:۔

(۱) قضاعہ:۔ حجاز کے شمال میں سکونت پذیر تھے۔

(۲) تنوخ:۔ پرانے زمانہ سے شام کے شمال میں رہتے چلے آتے ہیں۔

(۳) کلب:۔ صحرائے شام میں ان کی رہائش تھی۔

(۴) جہینہ اور عذرہ:۔ حجاز میں وادی اِضم ان کا مسکن تھا۔ قبیلہ عذرہ والے اپنے جذبات کی رقت اور عشق و محبت کی پاکیزگی میں بڑے مشہور تھے۔

نسب نگاروں نے عدنان کو بھی دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا ہے یعنی ربیعہ اور مضر۔ ربیعہ کے مشہور ترین قبائل یہ ہیں:۔

(۱) اسد:۔ جو وادی رمہ کے شمال میں رہتے تھے۔

(۲) وائل:۔ جو بکر و تغلب میں منقسم تھے جن کے درمیان کلیب کے قتل کے واقعہ کے بعد طویل جنگیں ہوتی رہیں جو قریب تھا کہ دونوں قبیلوں کو فنا کر ڈالتیں۔ یمامہ میں بنو حنیفہ اسی بکر بن وائل کی طرف منسوب ہیں۔

مضر کے مشہور ترین قبائل یہ ہیں:۔

(۱) قیس عیلان:۔ یہ قبیلہ اتنا مشہور تھا کہ بعض مرتبہ تمام غیر یمنیوں کو قیس ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ قیس ہی کی طرف ہوازن اور سلیم کی نسبت کی جاتی ہے جو نجد کے مغربی حصہ میں سکونت رکھتے تھے۔ اسی قیس کی طرف غطفان بھی منسوب ہے پھر غطفان دو مشہور قبیلوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عبس اور ذبیان۔ ان دونوں قبیلوں میں سخت عداوت تھی۔ ان کی مشہور ترین جنگوں میں سے وہ جنگ ہے جو جنگ داحس و غبراء کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) تمیم:۔ بصرہ کے صحرا میں رہتے تھے۔

(۳) ہذیل:۔ مکہ کے قریبی پہاڑوں میں سکونت رکھتے تھے۔ قبیلہ ہذیل اشعار کی کثرت اور عمدگی میں شہرت رکھتا تھا۔

(۴) کنانہ:۔ حجاز کے جنوب میں سکونت پذیر تھے۔ قبیلہ قریش انہی میں سے اور یہی اس قبیلہ کا سردار تھا۔

ربیعہ اور مضر کے درمیان سخت دشمنی تھی جو صدیوں قائم رہی اور اکثر ربیعہ یمنیوں کے ساتھ حلیف بن جاتے تھے تاکہ مضریوں سے جنگ کر سکیں۔

عرب کے مشہور قبائل اور ان کے اوطان کا یہ خلاصہ ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ انساب محل شبہ ہیں لیکن یہ صحیح ہوں یا غلط ہوں اہل عرب اس کے معتقد ہیں خصوصاً متاخرین کو اس پر اصرار ہے اور اپنی عصبیتوں کی بنیاد بھی انہوں نے اس پر قائم کر رکھی ہے۔ .... بہر حالات میں اپنے نسبی معتقدات کے مطابق وہ فرقوں اور طائفوں میں بٹے ہوتے ہیں ان کی یہ عصبیت ایک وہ کنجی بن گئی ہے جس سے ہم بہت سے تاریخی احداث کے اسباب کے پتے لگا سکتے اور اکثر شاعرانہ اور ادبی قطعات خصوصاً مفاخرہ و ہجو کو سمجھ سکتے ہیں۔

اسلام آیا تو عربوں کا یہ اعتقاد قطعی صورت اختیار کر چکا تھا کہ وہ نسب کے اعتبار سے تین بنیادی اصولوں میں منقسم ہیں۔ ربیعہ، مضر، یمن۔ شعراء اسی عقیدہ کے مطابق فخریہ اور ہجویہ قصیدہ گوئیاں کرتے رہتے تھے۔ بنو امیہ اور ان کے جانشینوں نے ان عصبیتوں سے فائدہ اٹھایا اور ایک کو دوسرے سے ٹکراتے رہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ (باقی)

مجلسِ اقبال

پروفیسر نکلسن نے علامہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس مثنوی کے بعض فلسفیانہ نکات کی تشریح خود علامہ اقبال نے کی تھی۔ اس تشریح کو نکلسن نے (علامہ اقبال کے الفاظ میں) مقدمہ میں شامل کرلیا تھا۔ چونکہ یہ چیز بڑی اہم ہوتی ہے کہ مصنف اپنے بعض نکات کی وضاحت خود کردے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی اس تشریح کو بھی قارئین کے سامنے لے آئیں تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ خودی کے متعلق خود حضرت علامہ کا خیال کیا تھا۔ اس تشریح کا (انگریزی سے) ترجمہ ارشاد الحق صاحب نے کیا تھا اور "حکمتِ اقبال" میں شائع ہوا تھا۔ اسے ہم بہ تشکر درج ذیل کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

"یہ مسئلہ کہ علم (تجربہ) محدود مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور ہمیشہ لفظ "یہ" کے محدود جامہ میں ملبوس ہوتا ہے۔ آخر میں جاکر ناقابلِ تشریح ہو جاتا ہے۔" یہ پروفیسر براڈلے کے الفاظ ہیں۔ لیکن جب وہ ان ناقابلِ تشریح مراکزِ علم سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو ایک وحدت نظر آتی ہے، جس کا نام وہ "مطلق" رکھتا ہے، اور جس میں تمام محدود مراکزِ علم اپنی محدودیت کو کھو دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کی رائے میں محدود مرکز محض ایک ظاہری شکل ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کا ثبوت ہمہ گیری ہے (یعنی حقیقت وہی ہے جو کل کو محیط ہے[۱]) اور چونکہ تمام محدودیت اضافی ہوتی ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ موخر الذکر محض فریبِ نظر ہے۔ میرے خیال میں (تجربہ) کا یہ ناقابلِ توجیہہ محدود مرکز کائنات کی حقیقتِ اساسی ہے۔ تمام زندگی انفرادی ہے۔ حیاتِ کلی کا کہیں وجود نہیں۔ خدا خود ایک فرد ہے اور وہ سب افراد میں یکتا و بے مثل ہے[۲]۔ کائنات بقول میکٹیگرٹ افراد کی ایک انجمن ہے۔ اس میں ہم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو نظم و ترتیب ہم اس میں پاتے ہیں وہ ازلی نہیں ہے اور بذاتِ خود مکمل ہے۔ بلکہ یہ ہماری جبلی اور شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہم رفتہ رفتہ فساد سے کون کی طرف جا رہے ہیں اور اس کے حصول میں ہم خود ہی معین ہیں۔ اس انجمن کے ارکان معین نہیں۔ ہمیشہ نئے نئے رکن وجود میں آتے اور اس عظیم الشان کام میں تعاون کرتے ہیں اس طرح کائنات کا فعل ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا ہے ابھی اس کی تکوین جاری ہے۔ لہٰذا کائنات کے متعلق کوئی کلی تصدیق نہیں قائم کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ (کائنات) ابھی "کل" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ عملِ تخلیق جاری ہے۔ اور انسان بھی اس میں بقدر اس کے حصہ لیتا ہے کہ وہ کم سے کم فساد کے ایک حصہ میں کون قائم کرنے میں امداد کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت سے کہ تبارک اللہ احسن الخالقین خدا کے سوا اور خالقوں کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کا یہ تصور فلسفۂ ہیگل کے جدید انگریز شارحین و تصوف (وحدۃ الوجود کی رغلط تعبیر کے) تمام اقسام کی مخالفت ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات اس میں ہے کہ اپنے آپ کو کائنات کی زندگی میں فنا کردے۔ ہمارے خیال میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی نصب العین نفیِ خودی نہیں ہے بلکہ اثباتِ خودی ہے اور جوں جوں اس کی انفرادیت اور یکتائی بڑھتی جاتی ہے وہ اس نصب العین کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔ یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔

---

[1] براڈلے غالباً ہیگل کے اثر سے فرد کی حقیقت کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فرد کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا بلکہ وجود مطلق کا ایک جزو ہے۔ علامہ اقبال اس خیال کے سختی سے مخالف ہیں۔ (مترجم) [2] امام احمد حنبل کا بھی خیال تھا لیکن انتہائی شدت کے ساتھ۔

اس طرح انسان جس قدر اس یکتا ترین ذات (یعنی خدا) سے مماثلت حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ بھی یکتا ہوتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات انفرادی ہے اور اس کی اعلیٰ شکل، "انا" (یعنی خودی) ہے جس کا فرد ایک واحد اور مستقل مرکز ہوتا ہے۔ انسان جسمانی نیز روحانی حیثیت سے غیر مشترک اور کافی بالذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی کامل فرد نہیں ہوا ہے۔ جس قدر اس کو خدا سے بعد ہوتا ہے، اسی قدر اس کی انفرادیت کم ہوتی ہے۔ کامل ترین انسان وہی ہے جو اقرب الی اللہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقرب الی اللہ خدا میں فنا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے خود خدا کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے[۵۱]۔ حقیقی انسان نہ صرف اس مادی دنیا کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے بلکہ اس کو مسخر کرکے خود خدا کو اپنے "انا" میں جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک آگے بڑھنے والی جاذبہ حرکت ہے اس کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح اپنا راستہ ہمیشہ صاف رکھتی ہے۔ اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل خیالات اور خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور بقا کے لئے اس نے کچھ آلات مثلاً حواس و ذہن وغیرہ کے ایجاد یا بذریعہ ارتقاء پیدا کر لئے ہیں جو اس کو رکاوٹوں کے جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں[۵۲]۔

خودی کی آزادی

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی نیچر (فطرت) ہے لیکن نیچر شر نہیں ہے کیونکہ وہ زندگی کو قوائے باطنی کے اظہار کے لائق بناتی ہے۔ "انا" کو آزادی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کے راستہ سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں یہ کچھ تو مختار ہے کچھ مجبور۔ (حدیث: سچا ایمان جبر و اختیار کے بین بین ہے) اور کامل آزادی اس ذاتِ واحد کی قربت سے حاصل ہوتی ہے، جو سب سے زیادہ آزاد ہے یعنی خدا۔ مختصر یہ کہ حیات عبارت ہے آزادی کی جد و جہد سے۔

خودی، "انا" اور تسلسلِ شخصیت

انسان میں مرکزِ حیات "انا" یا خودی یا شخص ہے (شخصیت اطناب[۵۳] کی ایک حالت ہے) اور اس کا تسلسل اس حالت کے قیام سے وابستہ ہے اگر اطناب کی حالت قائم نہ رہے تو استرخا[۵۴] پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ خودی (شخصیت) یا حالتِ اطناب انسان کی سب سے گراں قدر کامیابی ہے، لہٰذا اس کو خبردار رہنا چاہیئے کہ پھر استرخا کی کیفیت اس پر طاری نہ ہو جائے۔ جو چیز کشیدگی کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے، وہی ہمارے غیر فانی بننے کا موجب ہوتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدر و قیمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ اس سے خیر و شر کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں خودی کو مستحکم کرتی ہیں وہ خیر ہیں اور جو اس کو کمزور کرنے والی ہیں وہ شر۔ آرٹ[۵۵]، مذہب اور اخلاقیات[۵۶] پر خودی ہی کے نقطۂ نظر سے رائے قائم کرنی چاہیئے۔ افلاطون پر جو میرے اعتراضات ہیں، وہ دراصل ان تمام فلسفیانہ نظامات پر وارد ہوتے ہیں، جو زندگی کو چھوڑ کر موت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ جس میں زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور بجائے اس کو (مادے کو) مسخر کرنے کے اس سے بھاگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(باقی)

---

[۵۱] مولانا رومی نے اس خیال کو بہت واضح کیا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں ایک مرتبہ نبی صلعم جنگل میں غائب ہو گئے۔ حضرت حلیمہ سعدیہ مارے غم کے آپے سے باہر ہو گئیں۔ جب آپ جنگل میں ادھر ادھر سرگرداں حضور صلعم کی تلاش میں پھر رہی تھیں تو غیب سے ندا آئی: "رنج مت کرو، وہ گم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ساری دنیا اس میں گم ہو جائے گی۔"

حقیقی انسان دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ایک قدم آگے جاتا ہوں اور یہ اضافہ کرتا ہوں ؎

در رضایش مرضیِ حق گم شود　　این سخن کے باور مردم بود　　(اقبال)

[۵۲] آرزو صید مقاصد را کمند　　دفترِ افعال را شیرازہ بند

[۵۳] اطناب (Tension) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اسے خودی کا احساس قوی ہو۔

[۵۴] استرخا (RELAXATION) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اس میں یہ احساس کمزور ہو۔

[۵۵] قوم‌ہا از سکرِ او مسموم گشت　　خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

آں شنیدی کہ در عہدِ قدیم　　گوسفنداں در علف‌زارے مقیم

[۵۶] "عربی شاعری پر نبی صلعم کے اعتراضات" کے زیرِ عنوان ۱۹۱۶ء نیو ایرا میں صفحہ ۲۰۱ پر علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں:- انسانی جد و جہد کا آخری مقصد حیات ہے (جس سے مراد ایک شاندار، طاقتور اور کثیر الاصل زندگی ہے) تمام انسانی آرٹ اسی آخری مقصد کے ماتحت ہونے چاہئیں اور ہر شے کی قیمت اس کی حیات بخش قوت کے لحاظ سے معین ہونی چاہیئے۔ اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ قوتِ عمل کو بیدار کردے اور ہم کو زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لائق بنا دے۔ جو چیز خواب آور ہے اور ہم کو گرد و پیش کی اس حقیقت سے غافل کر دینے والی ہے جس کو مسخر کر لینے پر انحصارِ زندگی ہے، وہ زوال اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ میں افیون نوشی نہ ہونی چاہیئے۔ "تحسینِ فن برائے فن" کا اصول دورِ انحطاط اور پستی کی ایجاد ہے جو ہم کو فریب میں لاکر قوت و حیات سے بے بہرہ کر دینا چاہتا ہے۔

[۵۷] راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم　　از گروہِ گوسفندانِ قدیم

سبز بادا خاکِ پاکِ شافعی　　عالمے سرخوش ز تاکِ شافعی

عورت کا قرآن

(۲)

"مشرق" عنقریب ہی ایک نئی کروٹ لینے والا ہے اور اس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں میں "عورت" کی تعداد زیادہ ہے۔ نیز دُنیا ہر لحہ، ترقی کے زینے طے کر رہی ہے۔ ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ پرستی، نسلی امتیازات، طبقاتی تقسیم اور جغرافیائی امتیازات کی بندشیں ٹوٹ رہی ہیں، اس لئے لامحالہ مسلمان عورتوں کے سامنے بھی بہت سے مسائل آئیں گے اور انہیں اپنے ان حقوق کے قرار واقعی جاننے اور حاصل کرنے کی سعی و کوشش کرنا ہوگی، جو انہیں قرآن مجید نے عطا کئے ہیں۔ چنانچہ اس کی داغ بیل پڑ بھی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں مصر میں "بنت النیل" کے نام سے اور ۱۹۵۱ء میں "بنت الپاکستان" کے عنوان سے پاکستان میں انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد بتائے جو بھی جائیں، مگر مدعا یہ ہے کہ "مسلمان عورت"، پر جو مختلف قسم کی غیر انسانی اور غیر قرآنی پابندیاں اور قیود و بند لگا رکھی گئی ہیں اُن کو مطلقاً توڑ دیا جائے۔ بالفاظ دیگر کوشش یہ ہے کہ "مردوں" کے ناروا مظالم سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ یہ ردِ عمل ہے اس کا کہ اگرچہ "اسلام" یا "قرآن مجید" نے اپنے امتیازی نصب العین اور خصوصی نظام کے پیشِ نظر ہیئتِ اجتماعیہ میں، باستثناء چند "مرد" و "عورت" دونوں کو مساوی حقوق دیئے، مگر وہ حقوق قرار واقعی "عورت" کو ملتے نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ بُری طرح غصب کر لئے گئے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی سکریٹری جمعیۃ علماء ہند نے اپنی کتاب "اخلاق اور فلسفۂ اخلاق" کے صفحہ ۳۲۲ پر، جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی اعتراف کیا ہے کہ

> "اسلام نے معدودے چند مسائل کے علاوہ اگرچہ "عورت" کو تمام حقوق میں "مردوں" کے مساوی رکھا ہے مثلاً تعلیم کا حق دونوں کے لئے برابر ہے۔ اپنی مملوکہ اشیاء میں قانونی تصرفات کا مردوں ہی کی طرح پُورا حق عطا کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر عملاً ان حقوق سے "عورت" پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اموال کی ذمہ داری یا تو کسی قریبی عزیز کے سر ہوتی ہے اور یا کوئی وکیل ان کی طرف سے تصرف کا مختار ہوتا ہے اور عورتیں براہ راست ان معاملات میں بے دخل رہتی ہیں۔ اس طرح نکاح تک کے معاملے میں صرف والدین ہی مجازِ کل ہیں اور اُن کی اپنی رائے کی قطعاً پرسش و پرواہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان کو یہ بھی حق نہیں ہے کہ وہ ہونے والے شوہر کو ایک نظر دیکھ ہی لیں۔ اور ولی اگر اُن سے کسی قسم کا مشورہ بھی کرتا ہے تو وہ محض ایک رسمی صورت میں اور بس۔ نیز اُن کو ایک لمحہ کے لئے اس کی بھی اجازت نہیں ہے کہ وُہ معمولی حیوان کی طرح کھلی ہوا سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ باغات کی سیر کر سکیں اور اپنے شوہروں کے دوش بدوش تفریح گاہوں میں تفریح کر سکیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی ان امور کی جرأت کر بیٹھے تو گویا اُس نے خود کو طعنوں اور ملامتوں کے لئے پیش کر دیا۔ مصر تک میں بہت کم لڑکیاں یونیورسٹی میں علم حاصل کرتی ہیں۔ اور اُن کی تعداد کے اعتبار سے ثانوی مدارس میں بھی کم ہی پائی جاتی ہیں اور ابھی تک انہوں نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ اُن کے حقوق "غصب" کر لئے گئے ہیں، تا کہ وہ مطالبہ کرنے پر آمادہ ہوں۔"

مولانا موصوف کا یہ بھی فرمانا ہے کہ:

> "بیشک اسلام، نہ اس "افراط" کی اجازت دیتا ہے جو آزادیٔ حقوق کے نام سے مغرب، اور مغرب زدہ ملکوں میں عملاً پائی جاتی ہے اور جہاں "عورت" کی "جنسی مساوات" کے ساتھ ساتھ "صنفی مساوات" کو بھی تسلیم کر لیا گیا...... اور نہ وہ اس "تفریط" کا قائل ہے جس کی بدولت جہالت کے ہاتھوں "عورت" کے ساتھ ایک "باندی" یا "مملوکہ" یا "حیوان" کا سا سلوک کیا جائے۔" (صفحہ ۳۳۶)

بلاشبہ وہ دور گذر گیا جب "مرد" "عورت" کو ایک جانور سمجھتے تھے۔ اب "عورت" کو ہوش آگیا ہے کہ وہ بھی "انسان" ہے۔ لہذا "مرد" کو بقول نیاز فتح پوری:

> "اب تاریخ کو صرف اس لئے نہ پڑھنا چاہیئے کہ وہ مرد کی تاریخ ہے۔ تمدن کا مطالعہ صرف اس لئے نہ کرنا چاہیئے کہ وہ مرد کے قوائے دماغی کا نتیجہ ہے بلکہ اب تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیئے کہ تمام اعمال انسانی میں "عورت" بھی پوری پوری حصہ دار ہے۔"
>
> "تہذیب جدید" نے "عورت" کو علمی و عملی میدان میں بھی "مرد" کے دوش بدوش کام کرنے کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ اور آج کل یورپ کی معاشرت اس کی شہادت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اسی کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اخلاق نقطۂ نظر سے "عورت" کی حالت گر گئی ہے، اسی بناء پر بعض کا خیال ہے کہ "عورت" کے لئے تعلیم جدید یا اس کی آزادی مفید نہیں ہو سکتی، مگر ایسا خیال کرنا حقیقتاً واقعات سے غلط نتیجہ اخذ کرنا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ "عورت" کی تربیت کی طرف کبھی بھی صحیح اعتنا نہیں کیا گیا اور اس کا وہ اخلاقی زوال جو از منۂ قدیمہ سے شروع ہوا تھا اب بھی بدستور جاری ہے۔"
>
> (صحابیات۔ صفحہ ۱)

حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

قصورِ "زن" کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اُس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ "مرد" سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

مگر "عورت" کو بھی عقل سے کام لینا ہوگا۔ ہم عورتیں بظاہر آزادی کے سارے مراحل، حسب خواہش طے بھی کر لیں تو ہماری اسیری بہ باطن دور نہیں ہو سکتی ہم کامل آزاد ہو کے بھی قوانین الٰہیہ کے پیش نظر فطری طور پر "مرد" کے تعلق و تسلط سے آزاد نہیں ہو سکتے کیونکہ ہماری جبلّی کمزوری کچھ سہارا چاہتی ہے۔ ہمارے رنگ کی شوخی کپڑے کی محتاج ہے۔ ہماری شمع جب ہی اطمینان سے جل سکتی ہے جب فانوس ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ ؎

بظاہر بوئے گل کو باغ میں حاصل ہے آزادی
مگر موجِ ہوا میں وہ اسیرِ دام ہوتی ہے (الم مظفر نگری)

میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں مصر کی مشہور تنظیم "الاخوان المسلمون" کے روشن ضمیر لیڈر اور پیر و مرشد شیخ حسن البنا ...... نے بہت عمدہ خیال ظاہر کیا ہے۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا کہ

"آپ زندگی کے تمام دوائر میں عورتوں کی شرکت کے روادار ہیں یا نہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ

> "اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں کام کرنے کا حق مردوں اور عورتوں کو مساوی طور پر عطا کیا ہے، اگرچہ عورتوں کا فطری دائرہ عمل خانہ داری اور پرورش و تربیت اطفال ہی ہے۔ لیکن اگر عورتیں اپنے اس بنیادی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے بعد اتنی فرصت و استطاعت اور اہلیت رکھتی ہوں کہ زندگی کے دوسرے دوائر میں مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کر سکیں تو اسلام ان کو ہرگز منع نہیں کرتا۔ چنانچہ میری دو لڑکیوں نے ڈاکٹری اور نرسنگ کی باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اب شادیاں ہو جانے کے بعد وہ اپنے گھروں کے اندرونی وظائف کو بھی بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں اور ڈاکٹری اور نرسنگ میں بھی ملک کی خدمت بجا لا رہی ہیں۔"

"اخوان المسلمین" کے امام کا عورتوں کے حقوق و فرائض سے متعلق، قطعاً وہی خیال و عقیدہ ہے جو اسلام کی دستوری کتاب "قرآن" میں پیش کیا گیا ہے۔

صدرِ جمہوریہ ترکیہ، جناب جلال بایار

جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!

صدرِ جمہوریہ ترکیہ، جناب جلال بایار، کی تشریف آوری کے موقع پر ہم ذیل میں وہ مضمون دوبارہ شایع کرتے ہیں جو طلوعِ اسلام میں اپریل ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اپنی افادیت کے اعتبار سے آج بھی اتنا اہم ہے جتنا چند سال قبل تھا۔ اس کی آخری چند سطور ہیں جنہیں حذف کر دیا گیا ہے، یہ شکایت کی گئی تھی کہ پاکستان نے ترکی کی مثال سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی، حتیٰ کہ وہاں سفیر تک کا تقرر بھی نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ہماری یہ شکایت تو رفع ہو گئی کہ ہمارا وہاں ایک سفیر بھی نہیں، لیکن اوّل الذکر شکایت باقی رہی، کیونکہ ابھی تک یہ جاننے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ترکی جس انداز سے ایک جدید و ترقی یافتہ مملکت بنا اور جس طریق سے اُس نے اپنے معاملات کو سلجھایا، اُس میں ہمارے لئے کس قدر موعظت و عبرت اور راہ نمائی کا سامان ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ترکی کو قریب سے دیکھنے اور اچھی طرح سمجھنے کا اب وقت آگیا ہے۔ یہ موقع سال گذشتہ کے "پاک ترکی" معاہدے نے ہمیا کیا ہے۔ اب دونوں ممالک حیاتِ قومی کے گوناگوں شعبوں میں تعاون و اشتراک کا مظاہرہ کریں گے اور اس طرح ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ متاثر کر سکیں گے۔ ترکی اور پاکستان کو ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور مل کر اقوامِ مسلمہ کے لئے بالخصوص اور اقوامِ عالم کے لئے بالعموم ایک نیا اصولِ زندگی پیش کرنا ہے۔ مسلمانانِ ہند و پاک کو ترکوں سے جو والہانہ محبت شروع ہی سے رہی ہے وہ کسی یاد دہانی کی محتاج نہیں۔ یہ محبت جس طرح والہانہ تھی اسی طرح غائبانہ بھی تھی۔ یعنی یہاں کے عام مسلمانوں کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ ہم ترکوں سے اس قدر محبت کیوں کرتے ہیں اور اُن کے پاؤں کا کانٹا کیوں ہماری آنکھ میں چبھن پیدا کر دیتا ہے۔ اب ہم نے اگر ترکوں کا مطالعہ قریب ہو کر کیا تو یہ حقیقت علیٰ وجہ البصیرت سمجھ میں آجائے گی کہ جسموں کے اس قدر دُور ہونے کے باوجود، ہماری اور ترکوں کی روحیں کس قدر ایک دوسرے کے قریب تھیں (اور قریب ہیں)۔ اللہ کرے کہ اب یہ قریب سے قریب تر ہو جائیں اور یہی چیز اُفقِ اسلام سے ایک نئے خاور کے طلوع ہونے کا موجب بن جائے۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔

(طلوعِ اسلام)

اربابِ حکومت پاکستان کی طرف سے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ملکی اور ملی اصلاح و ترقی کی رفتار خاطر خواہ اس لئے نہیں کہ حالات غیر معمولی ہیں۔ حکومت یہ کہہ کر اپنی براءت کرتی ہے اور عوام اسے ناکافی سمجھ کر آہستہ خرامی کے شاکی ہیں نتیجۃً وہ افسوسناک خلا ہے جو حکومت اور عوام کو ایک دوسرے سے دور تر کر رہا ہے۔ حالات اگر واقعی غیر معمولی ہیں تو یہ مقامِ افسوس و گریہ نہیں نہ وجہ مایوسی بن سکتے ہیں۔ غیر معمولی حالات غیر معمولی عزم و ہمت کے متقاضی ہوتے ہیں اور جو قومیں میدانِ کارزار میں مجاہدانہ سرفروشی اور سخت کوشی کا ثبوت دیتی ہیں وہ غیر معمولی حوادث سے دوچار ہو کر پختہ تر و پائندہ تر ہو کے نکلتی ہیں۔ ان نازک مراحل میں قومی عمل اس یقینِ کامل کا مظہر ہونا چاہیئے کہ "سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں"۔ تاریخِ عالم میں دیگر قوموں پر بھی جانگسل لمحے آئے ہیں۔ قومیں ایسے ہلاکت کے گردابوں میں پھنسی ہیں کہ بظاہر ان کے بچ نکلنے کے امکانات کالعدم نظر آتے تھے لیکن ان کے عزمِ مصمم نے موت کے چکروں سے زندگی اور نجات کی سیدھی راہ تلاش کر ہی لی۔ ہمیں ایسی متوازی مثال کے لئے زمان و مکان میں چنداں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ترکی جس سے ہم نے دیوانہ وار وابستگی کا ثبوت دیا ہے اور جس کی نجات و بقا کے لئے ہمارے دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز غلغلہ انداز عالم ہوئے، وہی "غازی مصطفیٰ کمال پاشا" جس کی ہم بلائیں لیتے تھے اور جس کے دیدار کی تمنائے بیتاب ہمارے قلوب کے لئے وجہ نشاط تھی۔ اسی غازی مرحوم کا ترکی اسی طرح غیر معمولی حوادث و آلام کا شکار بنا۔ موجودہ ترکی کی جنگِ آزادی اور برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی جنگِ آزادی کی تحریکیں قریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں

ترک پہلی جنگِ عظیم کے مہیب غار میں گرے۔ مگر اپنی فوق العادۃ ہمت سے نئی زندگی حاصل کر کے اُبھرے وہ جنگِ حریت کا انہوں نے آغاز کیا تھا اس کا ثمرہ آزاد جمہوریہ ترکیہ کی صورت میں حاصل کر لیا۔ مسلمانانِ ہند و پاک کو پہلی جنگِ عظیم کے صدمات سے بمشکل فراغ ملا تھا کہ وہ تحریکِ خلافت کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ ترک اتاترک کی قیادت میں، اس اثناء میں کہیں سے کہیں نکل گئے۔ ۱۹۲۳ء میں آزاد جمہوریہ ترکیہ کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس سے ترکوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہوا کیونکہ چند ہی سال بعد دوسری جنگِ عالمگیر کے بادل گھرنا شروع ہو گئے۔ ترکی پامال ہو چکا تھا۔ نئی جنگ کی تاب میں کہاں سکت تھی؟ اس کی سلطنت محدود تھی۔ آبادی کم تھی، ذرائع حقیر تھے۔ یورپی سیاست کی کئی لہریں ترکی میں آکر متصادم ہوتی تھیں۔ ان از حد ناساعد حالات میں بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہ کر، ترکی نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ آنے والوں کے لئے امید اور زندگی کا مستقل پیغام ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۹ء تک کے سولہ سالوں میں کہ گذشتہ جنگوں کے اثرات سے بمشکل گلو خلاصی مل سکی تھی، ترکی پر آنے والی جنگ کا منحوس سایہ بھی پڑنا شروع ہو گیا۔ لیکن ترکی نے ان سولہ سالوں کا پورا فائدہ اُٹھایا اور تعمیرِ ملک پر حتی المقدور توجہ صرف کی۔ اگر ترکی غیر معمولی حالات سے دوچار تھا تو اس کے قائدین بھی فوق العادہ ولولۂ عمل رکھتے تھے۔ انہوں نے بے پناہ جوشِ عمل اور حسنِ سیرت سے قوم کو غیر معمولی حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ اور میدانِ ترقی میں بہت دور نکل گئے۔

اس مختصر سی صحبت میں ہم ترکی کی مساعی تعمیر و اصلاح پر طائرانہ نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس مختصر جائزے سے اندازہ ہو جائیگا کہ ترکی کی جد و جہد میں پاکستان کے لئے کس قدر عبرت و موعظت کا سامان ہے۔ پاکستان بدقسمتی سے "مصطفیٰ کمال" سے محروم ہے۔ لیکن اگر ہمارے قائدین میں کوئی ایک "مصطفیٰ کمال" نہیں تو کیا وہ سب مل کر بھی ایک "مصطفیٰ کمال" نہیں بن سکتے؟

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے

اس تبصرہ سے یہ مقصود نہیں ہے کہ پاکستان تفصیلی طور پر بھی وہی کچھ کرے جو ترکی نے کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان تفاصیل میں سے بعض سے اختلاف ہو جو وہاں اختیار کی گئی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جزئیات ہمارے مقتضیات کے مطابق نہ ہوں۔ لیکن ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسی قوم کی مثال موجود ہے جس پر اس سے کہیں زیادہ شدید اور مہیب خطرات گھر کر آگئے تھے جن سے ہم دوچار ہیں اور جو ہر اعتبار سے ہم سے بھی بدتر اور نازک حالت میں تھی۔ اس قوم نے اپنے آپ کو ان حالات میں نہ صرف محفوظ ہی رکھا بلکہ دنیا کی زندہ قوموں میں اپنا شمار کرا لیا۔ اس نے یہ کیسے کیا؟ یہ چیز ہمارے لئے نمونہ اور تقلید کا باعث بن سکتی ہے اور یہی اس تبصرہ کی غایت ہے۔

موجودہ ترکی، پاکستان کی طرح، از غیب معرضِ وجود میں آیا۔ پہلی جنگِ عظیم تک ہم جس ترکی سے شناسا تھے بلکہ جس کے خلیفہ کو اپنا خلیفۃ المسلمین سمجھتے تھے، اس عثمانی ترکی کا تعلق موجودہ کمال ترکی سے اسی قدر ہے جس قدر کہ سابقہ برعظیم ہند کا تعلق نوزائیدہ سلطنت پاکستان سے ہے۔ کمال اتاترک کا ترکی ایک نوزائیدہ سلطنت ہے یا تھی، بعینہٖ ایسے جیسے ہمارا پاکستان۔ پاکستان بطور خطۂ ارض پہلے سے ہی برصغیر ہند کے نقشہ پر موجود تھا۔ اس کے وہ باشندے بھی اس پر آباد و مکین تھے جو اب پاکستانی کہلاتے ہیں۔ پرانے "پاکستان" اور نئے پاکستان میں فرق یہ ہے کہ اب اہلِ پاکستان دورِ غلامی سے نکل کر اور آزاد و خود مختار ہو کر اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنے مزاجِ قومی کے مطابق اجتماعی زندگی کو ڈھال سکیں۔ سلطنتِ عثمانی اور موجودہ ترکی میں بھی یہی فرق ہے کہ موجودہ ترک دورِ غلامی سے نکل کر آزاد و خود مختار ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی کا حاکم نہیں، نہ محکوم ہے۔

ترکوں کی جنگِ آزادی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہوتا ہے جبکہ کمال پاشا کی قیادت میں ترک نوجوانوں نے ترکی کو ترکوں کے لئے

آزاد کرانے کا عزم کیا۔ یہ جنگ آزادی ۱۹۲۲ء میں ختم ہوئی جب کمال پاشا نے سلطنت عثمانی کے مرد بیمار کی تجہیز و تکفین کر کے آزاد ترکی کی طرح ڈالی۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانی افریقہ سے بے دخل ہو گئی۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان نے اسے یورپ سے پسپا کر دیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے اس کے تابوت میں آخری میخ بھی گاڑ دی۔ اور دول عظمیٰ نے ترکی کے حصے بخرے کر دینے کے لئے نپکنا شروع کیا۔ عثمانی مرد بیمار ان جنگوں سے جانبر نہ ہو سکا، وہ پوری طرح شکست کھا چکا تھا جنگوں کے ان مہیب زلزلوں سے عثمانیوں کے کوہ دشت "مانند سحاب اُڑ رہے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ترکوں کے اعماق قلوب سے زندگی اور آزادی کے نئے چشمے بھی پھوٹ رہے تھے۔ بیسویں صدی کا یہ تجربہ معمہ ہے کہ ترک شکست کھا کر فتحیاب ہوئے۔ اگر جنگ عظیم میں ترک فتح حاصل کر لیتے تو شاید وہ ان کی شکست ہوتی۔ انہوں نے اپنی خاکستر سے ایک نئی سحر تعمیر کی۔

یورپ کا مرد بیمار محض عسکری نقطۂ نگاہ سے ہی بیمار نہیں تھا بلکہ وہ از سرتاپا مجموعۂ امراض بلکہ مجسم مرض تھا۔ عثمانی نظام سلطنت از حد فاسد و بوسیدہ ہو چکا تھا۔ دین و دنیا کہ ایک ہی کل کے دو اجزا ہیں زندگی کے دو جدا گانہ دائرے بن گئے تھے۔ سلطان خلیفہ بھی تھا۔ سلطان کی حیثیت سے اس کا ایک وزیر اعظم تھا اور خلیفہ کی حیثیت سے "شیخ الاسلام" کا فریضہ تھا کہ جب کوئی قانون منظور ہو تو وہ اس کا معائنہ کرے اور فتویٰ دے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ ثنویت مرکز کی حدود سے نکل کر نظم و نسق حکومت کے تمام شعبوں پر حاوی تھی۔ دنیاوی عدالتیں علیحدہ تھیں اور مذہبی علیحدہ۔ سکول علیحدہ تھے اور مدارس علیحدہ۔ صوبوں میں بیک وقت حاکم (گورنر) بھی تھے اور مفتی بھی۔ سلطنت کا خزانہ تک علیحدہ تھا اور بیت المال، علیحدہ۔ اس ثنویت کی عملی کارفرمائی کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک ہی نمونہ کافی رہے گا۔ ایک موقع پر حدود مملکت میں اس کثرت سے افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ حکومت کو ان کا سد باب کرنے کے لئے حرکت کرنا پڑی۔ مجلس وزراء نے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ فلاں حجام کی گردن اُڑا دی جائے (تاکہ افواہوں کا مزعومہ سرچشمہ بند ہو جائے) اس پر شیخ الاسلام بولے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا حجام ہے۔ مجلس وزراء نے جواب دیا؛ اسی کے سر میں کیا تخصیص ہے، اسی کے پڑوسی حجام کا سر اڑایا جا سکتا ہے!

اس ہمہ گیر شکست و ریخت اور ذہنی اور جسمانی شغل میں غیور ترکوں نے تعمیر وطن کا عزم کیا۔ ان کا پیش نہاد ایک توی، صحیح الجثہ اور ہنرمند قوم کی تربیت تھا۔ قومی جوہر صدیوں سے خوابیدہ تھا۔ عوام جاہل اور مفلس تھے۔ ان کے ذرائع محدود اور حقیر تھے۔ مصطفےٰ کمال اور اُن کے رفقاء بیرونی اعداء سے عہدہ برآ ہو چکے تھے۔ اب کوئی بیرونی دشمن پیش نظر نہیں تھا۔ اب جنگ کی نوعیت پہلی جنگوں سے یکسر مختلف تھی۔ ان کی نئی جنگ خود اپنے خلاف تھی۔ صدیوں کے تعطل اور جمود سے نکل کر انہیں زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہونا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے جس شدت عمل کا مظاہرہ کیا وہ ایک حیات انگیز داستان ہے، اور اس کا بین ثبوت کہ ایک مرد میدان و کار کا دائرۂ عمل بے حدود و بے ثغور ہے۔ آغاز سفر میں مصطفےٰ کمال نے قومی نمائندوں یعنی مجلس ملی کے ارکان سے خطاب کیا۔ یہ خطاب خیالات و افکار کا نہ تھمنے والا دھارا تھا۔ کمال آٹھ دن تک متواتر بولتا رہا۔ اس نے اس خطاب کی تیاری کے لئے کچھ نہیں کیا، نہ مسودہ تیار کیا، نہ یادداشتیں مرتب کیں۔ ترکی کا ماضی اور حال اس کے دل بصیر و خبیر پر کما حقہٗ روشن تھا اور وہ جانتا تھا کہ ترکی کی قوم کی تقدیر کو کیا ہے۔ کمال نے قرون ماضیہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اپنی جنگ آزادی کا جائزہ لیا اور اس جمہوریت کا احساس دلایا جس کی طرح ڈالنے میں ترک کامیاب ہو چکے تھے اور جس کی تعمیر کے گراں بار فریضہ سے انہیں سبکدوش ہونا تھا۔ اس نے ان نمائندوں کو بتایا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں، اور انہیں سب کچھ درکار ہے۔ جو آزادی انہوں نے عظیم الشان قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے اس کا آئندہ کے لئے تحفظ بھی کرنا ہو گا اور انہیں اس کے تحفظ کے لئے مطلوبہ قوت فراہم کرنی اور موجودہ رکھنی ہو گی۔

مصطفےٰ کمال نے ژرف نگاہی سے قوم کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ اور ان کو تقدیر نو کی میزان میں دیکھا۔ وہ سوچنے اور کر گزرنے کا قائل تھا۔ وہ جب کسی اقدام کا فیصلہ کر لیتا تھا یا اسے قوم کے لئے ضروری سمجھتا تھا تو وہ غیر معمولی محنت اور جاں فشانی سے اس کے لئے مادی وسائل مہیا کر لیتا تھا اس کا طریق نیصد حیران کن تھا اور عمل بے پناہ۔ اس نے دیکھا کہ مشرق پر سکوت مرگ چھایا ہوا ہے اور مغرب جہد حیات کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس کے ولولۂ عمل کی تسکین مشرق کے قبرستان میں نہیں ہو سکتی تھی وہ بے اختیار جانب مغرب چل نکلا۔ اسے کم سے کم وقت میں سب کچھ کرنا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ گوارا نہیں کیا کہ مغرب جن مسائل کو حل کر چکا ہے ترکی از سرنو ان مسائل سے دوچار ہو اور ان کا حل سوچنے پر مزید وقت ضائع کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ترکی ذہنیت میں ارتقاء نہیں ہوا بلکہ وہ یکایک معرض وجود میں آ گئی۔ معرض وجود میں کیا آئی اسے قوم پر مسلط کیا گیا۔ یورپ نے جو نتائج صدیوں کی کشمکش اور تجربوں کے بعد حاصل کئے ترکی ایک دن میں ان پر عمل پیرا ہو گیا۔ اس نے تجربہ شدہ اصولوں کو پھر سے نہیں آزمایا اور بوسیدہ معتقدات و نظریات کو ایک لمحہ کے لئے بھی عزیز نہ جانا۔ اس طرح مصطفےٰ کمال نے چند سالوں میں ہی ترکی کی ہیئت تبدیل کر دی۔ یہ انقلاب خارج میں نہیں تھا بلکہ اس کے دھارے روح قومی کے منبع سے پھوٹے۔ یہ موقع اس بحث میں الجھنے کا نہیں کہ کمال تقلید مغرب میں کہاں تک حق بجانب تھا۔ تقلید مغرب کا اعتراض کرنے والے اکثر بے بصیری کا ثبوت دیتے ہیں وہ کمال کے گرد و پیش کا کماحقہٗ احساس نہیں رکھتے۔ اس اعتراض کی حقیقت کچھ بھی ہو، یہ صحیح ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال جذبات کی دل فریب مگر پُرپیچ وادیوں میں کھو جاتا تو آج ترکی کا ہی نہیں، دنیائے اسلام کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

مصطفےٰ کمال نے قدیم قسطنطنیہ کی روایتی مشرقیت اور اس کے رفیع و عظیم محلات شاہی کی پُر تکلف فضا کو خیرباد کہہ کے اندرون ملک انگورہ کو دار الحکومت بنایا جس کا نام بعد میں بدل کر انقرہ رکھ گیا۔ انگورہ استنبول کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ تھا اور تجارتی نکتۂ نگاہ سے بھی زیادہ موزوں مرکز تھا۔ نیز انگورہ کے گرد و نواح کی فضا ترکوں کی روایتی عسکریت کی پرورش کے لئے بہترین ماحول تھا۔ یہ نئی فضا ان جراثیم سے پاک تھی جو عثمانی سلطنت کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے۔ اس نئی فضا میں نئی قومیت کی داغ بیل ڈالی جا سکتی تھی۔ صحرا کے درمیان بے آب و گیاہ علاقہ میں ایک پہاڑی کے اوپر انگورہ کا گاؤں آباد تھا۔ یہ گاؤں جفاکش اور سخت کوش ترکوں کا مستقر منتخب ہوا۔ نئی سلطنت کے دار الحکومت کے لئے پانی اور بجلی کی وافر مقدار میں اشد ضرورت تھی اور انگورہ کے ضلع میں نہ پانی تھا نہ بجلی کا سرچشمہ۔ ترک کی فطرت نے اقبال کے الفاظ میں خدا سے خطاب کیا:-

بیابان و کہسار و راغ آفریدی ۔۔۔ خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم ۔۔۔ من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

قدرت کی کمی کو پورا کر دینے کا عزم مصمم کر لیا گیا۔ ایک وادی منتخب ہوئی اس میں کا ایک گاؤں ہٹا دیا گیا۔ اور علاقہ بھر کے ندی نالوں کا رُخ بدل کر اس وادی کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس طرح پہاڑیوں کے اوپر ایک وسیع و عریض مصنوعی جھیل بن گئی جس کے ایک سرے پر انہوں نے اپنے سرمایہ سے ایک بند بنا دیا۔ ضلع انقرہ کی آبپاشی اسی جھیل سے ہوتی ہے اور اسی جھیل سے پینے کا پانی بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ اور بجلی پیدا کرنے کے کارخانے بھی اسی سے قائم ہو گئے ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے اسی بے آب و گیاہ علاقے میں ایک مثالی زرعی فارم قائم کیا یہ "غازی فارم" آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں زراعت کے جدید ترین تجربے کئے جاتے ہیں۔ ہر کسان اس میں آ کر تجربے حاصل کر سکتا ہے اور بیش قیمت مشورے لے سکتا ہے۔ اخراجات کے لحاظ سے یہ فارم خود کفیل ہے۔

زرعی فارم سے بات عمومی زراعت کی طرف آ گئی۔ یہ بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ ترکی نے کیا زرعی انقلاب پیدا کیا۔ جریدہ "فنانشل ٹائمز" لندن کا نمائندہ خصوصی جریدہ کی یکم فروری ۱۹۶۳ء کی اشاعت خاص میں لکھتا ہے:-

> مجھے ایک ایسا زرعی ادارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں نہایت عرق ریزی اور جامعیت سے اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا کہ کون کون سے علاقے کس کس زرعی پیداوار کے لئے موزوں ترین ہیں (ماہرین کے) گروہ کے گروہ اطراف و اکناف میں پھیل گئے ہیں اور وہ تجربوں پر تجربے کر رہے ہیں کہ مختلف پھل اور زرعی پیداواریں کس طرح مختلف زرعی زمینوں میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ جب نتائج برآمد ہوتے ہیں ادارہ کو اس کی اطلاع بھیجدی جاتی ہے جہاں سے وہ اطلاعات وزارت زراعت کے حوالہ کر دی جاتی ہیں وزارت اس کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ فلاں فلاں علاقہ میں صرف فلاں فلاں قسم کی چیزیں ہی اگائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کی زمین اور آب و ہوا صرف انہی کے لئے موزوں ترین ہے۔ اس روش کے نتائج غیر معمولی طور پر خوشگوار اور حیران کن نکلے ہیں۔ اس کے علاوہ کاشت کے سلسلہ میں مشینوں کا کثرت سے استعمال ہو رہا ہے اور امدادی مہم کے طفیل جدید ترین آلات کے ذریعہ سے زرعی ترقی کے نئے مدارج طے ہو رہے ہیں۔

محنت اور مستعدی سے ترکی نے زرعی اجناس کی کیفیت اور کمیت میں خاطر خواہ اضافہ کرلیا ہے۔ اس سے آگے صنعتی ترقی میں بھی بہت مدد ملی، کیونکہ مختلف صنعتوں کے لئے جن خام اجناس کی ضرورت تھی وہ وافر مقدار اور بہتر حالت میں خود ترکی سے ہی دستیاب ہوگئیں اور اسے بیرونی ممالک سے گراں اجناس خرید کر قومی دولت کو ضائع نہیں کرنا پڑا۔ اس طرح اب ترکی جو خام اجناس برآمد کرتا ہے اس سے قابل قدر مالی منافع حاصل ہوتا ہے۔

جنگ عظیم میں شکست کھا جانے کے بعد ترکی مالی لحاظ سے مفلس ہو چکا تھا۔ دشمن اس کی کمی اور مجبوری سے بخوبی واقف تھے۔ لوزان کانفرنس میں عصمت انونو نے جس چابکدستی سے لارڈ کرزن کو شکست دی وہ حیرت مند داستان ہے۔ چنانچہ جب قدم قدم پر عصمت انونو نے کرزن کے مطالبے ٹھکرائے اور مطلوبہ مراعات کو یکے بعد دیگرے مسترد کرنا شروع کیا تو لارڈ کرزن نے یوں دھمکی دی:-

امن قائم ہو جانے کے بعد ترکی کا حشر کیا ہوگا؟ آپ کو سارے ملک کی از سر نو تعمیر کرنا ہوگی اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی (آپ جانتے ہیں کہ) روپیہ میرے ملک میں ہے، لندن میں! آپ جب بھی روپیہ حاصل کرنے کے لئے ہم سے گفتگو کریں گے میں یہ رد کئے ہوئے کاغذات سامنے رکھ دوں گا۔ (اور بزور منواؤں گا)

مالی بحالی اور ترقی کے لئے ترکی کے پاس ذرائع نہیں تھے۔ سابقہ عثمانی سلطنت اس ضمن میں بدنام تھی۔ نئی سلطنت کی ساکھ قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ شروع میں کسی کا دست نگر نہ ہوا جائے۔ لیکن ترکی میں نہ بینک تھے نہ بینکوں کا مناسب تجربہ ہی ترکوں کو حاصل تھا۔ بلکہ ایک بین الاقوامی ماہر بینک کی حتمی رائے تھی کہ ترک بینک چلا ہی نہیں سکتے۔ کمال پاشا نے ۱۹۲۰ء میں ایک بینک قائم کرنا چاہا لیکن حالات ناساز گار تھے اور وہ کچھ جھجکا بھی۔ بالآخر اس نے ایک لاکھ ترکی پونڈ ایک غیر ملکی بینک سے کہ جہاں وہ جمع تھے نکلوائے اور انہیں ایک تھیلے میں ڈال کر ایک دوکان میں رکھ دیا اور جلال بایار کو بلایا (جو بعد میں ترکی کے وزیر اقتصادیات اور پھر وزیر اعظم بنے اور اب صدر جمہوریہ ہیں) اور کہا کہ یہ لو روپیہ۔ آج سے آپ ترکی کے نئے بینک کے ڈائرکٹر ہیں۔ یہیں سے ترکی کا نیا بینک شروع ہو گیا۔ کاملاً ترکی سرمایہ سے اور کلیتہً ترکی عملہ سے ۱۹۳۷ء میں خالصتہً قومی ترکی بینکوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی تھی۔

ترکی نے اپنے بجٹ کو ہمیشہ متوازن رکھا۔ اس نے کوئی قرضہ نہیں لیا۔ اور سابقہ قرضوں کی ادائیگی میں پوری دیانت داری کا ثبوت دیا۔ اور بالکل بروقت ادا کئے۔

تعلیمی حیثیت سے ترکی ایک پسماندہ ملک تھا۔ اس کا تناسب خواندگی ۱۰ فی صدی تھا۔ کمال ترکی کو اقتدار نو سے ہم کنار کر رہا تھا اور اس کے لئے تعلیم اشد ضروری تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہمہ گیر جہالت کی ایک وجہ عربی رسم الخط اور دیگر لسانی اشکالات ہیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ رسم الخط لاطینی ہونا چاہیئے اور زبان کو غیر ضروری الفاظ سے پاک کر دینا چاہیئے۔ کمال جب ایک بار خیال کر لیتا تھا کہ کوئی شئے قوم کے حق میں مفید ہے تو وہ نہایت جرأت سے اور بلا خوف لومۃ لائم اسے نافذ بلکہ مسلط کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ عام حکم ہو گیا کہ سوائے لاطینی رسم الخط کے اور کوئی رسم الخط استعمال نہ ہو۔ کمال نے خود لسانیت کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس انقلابی تبدیلی کے لئے وہ کچھ کیا جو ماہرین سے بھی نہ بن پڑتا تھا۔ رسم الخط بدل لینے اور زبان آسان کر دینے کے بعد قوم کو خواندہ بنانے کی مہم شروع ہو گئی۔ سکول کھلے۔ کالج قائم ہوئے، یونیورسٹیاں بنیں۔ تعلیم عام جبری اور مفت ہوگئی۔ خود کمال گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھرتا۔ اور گلیوں میں بازاروں میں، درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر عوام کو سبق پڑھاتا اور ان سے سبق سنتا۔ اس طرح سارا ترکی ایک سکول بن گیا، جس کا ہیڈ ماسٹر کمال تھا۔ چند ہی سالوں میں ناخواندگی کا تناسب ۹۰ سے ۲۵ فی صدی ہو گیا۔

کمال انتھک تھا۔ وہ سائنسدانوں اور ماہرین کی صحبت میں دنوں کسی موضوع پر غور و فکر کر سکتا تھا۔ کوئی موضوع ہو اس کا ذہن اس پر غور کرنے کے لئے مستعد ہوتا تھا۔ عصمت انونو کا بیان ہے کہ کمال چوبیس چوبیس گھنٹوں تک بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کے لئے مسلسل کتابوں اور کاغذات میں محو رہا ہے۔ جب کوئی مسئلہ اس کے سامنے آجاتا تھا تو وقت کا تصور ختم ہو جاتا تھا۔ نہ اسے آرام ہی کی سوجھ سکتی تھی۔

کمال ذہین تھا۔ ہی نہیں تھا، وہ بے پناہ جرأت کا مالک تھا۔ وہ فیصلہ کر لینے کے بعد پہاڑ کی طرح اٹل ہو جاتا تھا۔ جب اس نے رقیبانہ توسیعت اور قدامت کے مظہر رومی ٹوپی کو اڑا دینے اور اس کے بجائے ہیٹ کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ایک دن پوچھا کہ ترکی میں سب سے زیادہ قدامت پسند علاقہ کون سا ہے؟ جواب ملا، کسٹوموتو، اس کا کونسا حصہ سولوبیت کا گھر ہے؟ داد ہے! دوسری صبح کمال اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گیا اور وہاں کے رہنے والوں کو جمع کر کے اپنا ہیٹ دکھایا اور انہیں بتایا کہ آئندہ انہیں یہی پہننا ہوگا۔ قدرتی طور پر اس فیصلہ اور اقدام کو شروع شروع میں ایک "مذاق" سمجھا گیا، لیکن کمال نے ایک تاریخ معین کر کے؛ اعلان کر دیا کہ اس کے بعد جو شخص اس ٹوپی کو استعمال کرے گا اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ بظاہر یہ معمولی اور غیر اہم سا مسئلہ ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمال کی نگاہ کس قدر ہمہ گیر تھی اور وہ فیصلوں کی ترویج میں کس قدر متشدد تھا۔ کسی فیصلے کے لئے اسے یہ یقین کافی ہوتا تھا کہ وہ قوم کے حق میں مفید ہے۔ اس یقین کے بعد وہ اسے بغیر رائج کئے ٹلتا نہیں تھا۔ کوئی اقدام اس کے نزدیک غیر اہم نہیں تھا۔

کمال کی شخصیت ایسی موثر اور بے پناہ تھی کہ وہ کسی رقت کسی مجمع میں چلا جاتا اور اس کا رنگ بدل دیتا۔ افراد اتنے متاثر ہوتے کہ ان کی مایوسی کافور ہو جاتی اور اعتماد ذات ابھر آتا۔ وہ ایک دوسرے سے مربوط ہو کر سب مل کر اتاترک کے پیچھے ہو لیتے۔ اپنی قوم کا یہ قائد پوری طرح ہر دل عزیز اور محبوب تھا۔ قوم اور کمال کے مابین کوئی خلا نہیں تھا!

کمال نے جب صنعتی ترقی کا فیصلہ کیا اور پنج سالہ اوقات نامہ تیار کیا تو اچھے اچھے ماہرین دنگ رہ گئے۔ ترکی ایسا قلاش ملک اس حسین خواب کو کیسے متشکل کر سکے گا؟ سرمایہ ناپید اور صنعتی ہنر مندی مفقود! بیرون ملک سے ماہرین بلائے گئے اور انہیں شاہانہ مشاہرے دیئے گئے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ساتھ ساتھ ترکوں کو بھی تیار کریں۔ ہر ماہر کے ساتھ ایک معاون ترک لگا دیا گیا۔ میعاد معاہدہ ختم ہو جانے پر وہ ترک غیر ملکی ماہر کی جگہ لے لیتا تھا۔ اس طرح چند ہی سالوں میں زندگی کے ہر قابل ذکر شعبہ میں ترک ماہرین تیار ہو گئے اور ملک غیر ملکیوں کا محتاج نہ رہا۔

ہم نے کمال کے چند اقدامات پر سرسری تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرہ کو ترکوں کی جدوجہد کا جائزہ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ یہ مقصود ہی تھا۔ ہم ترکی کی یہ مثال دے کر بتانا چاہتے ہیں کہ مردان کار ہمت بلند سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ کمال کا جہاد اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ غازیان بخت کوش کس طرح قوموں کو نئی زندگی بخش دیتے ہیں اور قومیں ان کے دم سے کس سرعت سے بام عروج و ترقی پر پہنچ جاتی ہیں۔ آج پاکستان کے لئے بہترین قابل تقلید مثال ترکی کی ہے۔ پاکستان ترکی کے تجربات سے بہت حد تک مستفید ہو سکتا ہے۔ بلکہ دونوں ممالک کی مشابہت کے پیش نظر کئی اعتبارات سے پاکستان کو تنہا ترکی سے ہی مدد مل سکتی ہے۔

مشتہرین کیلئے

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گزرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ .. .. فی اشاعت .. .. ایک سو پچاس روپے
نصف صفحہ .. .. اسی روپے

ٹائیٹل کے صفحات

دوسرا صفحہ ———— پچاس فی صدی زائد
تیسرا صفحہ ———— پچیس فی صدی زائد
چوتھا صفحہ ———— پچھتر فی صدی زائد

مزید تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

کیا ترکی نے اسلام ترک کر دیا ہے؟

علامہ اقبال کا جواب

۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال نے مسئلہ قادیانیت پر ایک بیان کی صورت میں بصیرت افروز روشنی ڈالی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے تین مضامین لکھ کر جہاں بقول اقبال دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا وہاں ایسا طریق اختیار کیا "جس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔" بہرحال اس سلسلہ میں پنڈت جی نے یہ بھی لکھا کہ ترکوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ علامہ اقبال نے ایک مبسوط مضمون کے ذریعہ پنڈت نہرو کے اعتراضات کا مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ذیل میں اس مضمون کا وہ اقتباس درج کیا جا رہا ہے جس میں ترکوں کے مزعومہ ترکِ اسلام پر بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث آج بھی ویسی ہی دلچسپ اور مفید ہے جیسی کہ بیس سال اُدھر تحریر کے وقت تھی۔ (طلوعِ اسلام)

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص کر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ایک خاص فقہی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے، یعنی توحید اور ختمِ نبوت، تو اس کو ایک راسخ العقیدہ ملا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیات قرآنی کی تاویلات میں وہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالباً پنڈت نہرو کے ذہن میں مفروضہ یا حقیقی اصلاحات ہیں جو اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لئے ان کا جائزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادی نقطۂ نظر کا نشوونما اسلام کے منافی ہے؟ مسلمانوں میں ترکِ دنیا کا بہت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اب وقت آگیا ہے کہ وہ حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مادیت مذہب کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے لیکن ملا اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کے لئے ایک موثر حربہ ہے جو عمداً لوگوں کو اس غرض سے گرفتارِ حیرت کر دیتے ہیں کہ ان کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسلام کی روح مادہ کے قرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا دنیا میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھولو۔ ایک غیر مسلم کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں دنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے اس کے لحاظ سے مادی نقطۂ نظر کی ترقی تحقیقِ ذات کی ایک صورت ہے۔ کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں اور بحیثیت ایک معاشرت کے اس کی نہ کوئی مخصوص زبان ہے، نہ کوئی مخصوص لباس۔ قرآن کا ترکی زبان میں پڑھایا جانا تاریخ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں کیونکہ عربی زبان و ادب کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے تو وہ عربی ہے۔ بہرحال اب ہمیں یہ اطلاعیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن کا پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ تو کیا کثرتِ ازدواج کی ممانعت یا علماء پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافی اسلام ہے؟ بہ فقہ اسلام کی رو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مجاز ہے کہ شرعی اجازتوں کو منسوخ کر دے بشرطیکہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ یہ اجازتیں "معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔" رہا علماء کا لائسنس حاصل کرنا۔ آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملا کی ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ رسول کریمؐ کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رو سے وعظ کرنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے۔ خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہے یا نہیں۔ تاہم یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے۔ سوئز قانون اور اس کے قواعد وراثت کو اختیار کر لینا ضرور ایک سنگین غلطی ہے جو جوشِ اصلاح کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے اور ایک ایسی قوم میں جو سرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ پیشوایانِ مذہب کے نتیجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات ایسی راہِ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے جس کے اثر کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ترکی اور نیز تمام دنیائے اسلام کو اسلامی قانونِ وراثت کے ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جن کو فان کریمر "فقہ اسلام کی بے حد اچھی شاخ" سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخِ خلافت یا مذہب و سلطنت کی علیحدگی منافی اسلام ہے؟ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ میں جو بنو امیہ کے زمانہ سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی اسلام کی روح اتاترک کے ذریعہ کارفرما ہو رہی ہے۔ مسئلہ خلافت میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لئے ہمیں ابن خلدون کی رہنمائی حاصل کرنی پڑے گی جو اسلام کا ایک جلیل القدر فلسفی، مورخ اور تاریخ جدید کا ابوالآباء ہے۔ میں یہاں اپنی کتاب "اسلامی تفکر کی تشکیلِ جدید" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور "مقدمۂ تاریخ" میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین ممتاز نقطۂ نظر پیش کئے ہیں۔ (۱) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے اسی لئے اس کا قیام ناگزیر ہے (۲) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے (۳) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں۔ آخرالذکر خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہوریین تھے۔ ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے خیال کی طرف مائل ہے یعنی معتزلہ کے اس خیال کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہم کو اپنے سیاسی تفکر میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے رہنمائی لینی چاہئے جو بلاشک و شبہ اس واقعہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا تفکر و تخیل عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر رہا۔ یہ تخیل اس وقت قابل عمل تھا جبکہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

جوانانِ تتاری

مندرجہ ذیل اشعار ایک حصہ ہیں مشہور نظم "طلوعِ اسلام" کا جو علامہ اقبال نے ۱۹۲۲ء میں انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم میں جرمنی جیسی صاحب جبروت قوم، باوصف غیر معمولی آلات حرب، شکست کھا گئی تھی لیکن سلطنت عثمانی کے بطن سے زندہ تر، تابندہ تر کمالی ترکی معرضِ وجود میں آ گئی تھی۔ نظم کیا ہے، دل کی گہرائیوں سے ابھرا ہوا چشمہ ہے جو جوشِ مسرت سے بے تاب بنتا چلا جا رہا ہے۔ یہ درحقیقت ترجمان ہے اس والہانہ محبت کا جو مسلمانانِ ہند و پاک کو شروع سے ترکوں کے ساتھ رہی ہے۔

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس طرح صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تعمیرِ ملت ہے

بین الاقوامی جائزہ

جزائر فارموسا سے اُٹھنے والے جنگ کے بادلوں نے بین الاقوامی مطلع تاریک کررکھا تھا کہ ماسکو سے یہ خبر اچانک طور پر آگئی کہ وزیر اعظم جارجی مالنخوف نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ یہ خبر اچانک ضرور تھی لیکن یہ روسی "انقلاب" غیر متوقع نہیں تھا۔ اسٹالین کی موت کے بعد ہی یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آگئی تھی کہ مرکز اشتراکیت جس طاقتور شخصیت سے محروم ہوا ہے اس کا بدل نہیں مل سکا۔ اس سے اقتدار کی ایک مخفی جنگ شروع ہوگئی جسے ہرچند زعمہ ور کی چابکدستی سے دبائے رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا واویلا بیرون روس اکثر سُنا جاتا رہا۔ مالنخوف کا استعفیٰ اسی جنگ کے نشیب و فراز کے سلسلہ لامتناہی کی ایک کڑی ہے اور اس سے دُنیا بھر کے سامنے یہ سوال اور شدت سے آگیا ہے کہ کیا روس اب جنگ کی طرح ڈالے گا۔؟

سٹالین کی موت کے بعد روسی قیادت کے اُقنوم ثلاثہ مالنخوف، بیریا اور کروشیف تھے۔ مالنخوف وزیر اعظم ہوئے۔ بیریا حفاظتی خفیہ پولیس کے حاکم اعلیٰ اور کروشیف کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری، روس میں یہ تینوں عہدے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ وزیر اعظم حکومت کا سربراہ ہوتا ہے۔ کیمونسٹ پارٹی کا سکریٹری پارٹی کا لیڈر، لہٰذا حکومت کا محتسب ہوتا ہے۔ خفیہ پولیس کا حاکم، روس ایسی پولیس مملکت میں، جتنے بھی اختیار کا مالک ہو کم ہے۔ مالنخوف کو شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ اسے قابلیت کی بناء پر نہیں بلکہ اسے مصلحت کے تحت وزیر اعظم بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ راہ اختیار کی کہ مغرب سے بظاہر نرمی کا سلوک کرے اور امن پسندی کا سبز باغ دکھا کر انہیں اسلحہ بندی سے روکے۔ خیال یہ تھا کہ اگر ایسی کامیابی حاصل ہوگئی تو اندرون ملک اسلحہ بندی کم کرکے اشیائے صرف کی پیداوار بڑھاکر روسی عوام کی حمایت حاصل کی جاسکے گی۔ اس نرم حکمت عملی کو حلقہ بگوش ممالک میں کمزوری پر محمول کیا گیا اور جگہ بہ جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ آگ خصوصیت سے مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی میں پھیلی۔ اس سے لامحالہ روسی وقار کو صدمہ پہنچا۔ اس صورت حالات سے مفر کی یہ صورت نکالی گئی کہ سارا الزام بیریا کے سر تھوپ دیا گیا اور اسے قربانی کا دُنبہ بناکر گولی سے اڑا دیا گیا۔ بیریا کی موت پر قریباً سبھی عناصر متفق تھے۔ کیونکہ اسے وہ اپنی راہ میں روڑا سمجھتے تھے۔

بیریا درمیان سے نکل گیا تو جنگ اقتدار مالنخوف اور کروشیف تک محدود ہوگئی اس مرحلہ میں ایک اور ہیرو بھی اُبھر کر سامنے آگیا۔ بیریا کی موت کے بعد مارشل زوکوف کو کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی پارٹی کا رکن بنادیا گیا۔ مارشل زوکوف نے نہ صرف ماسکو میں جرمنوں کو شکست دی بلکہ برلن پر بھی اس نے قبضہ کیا تھا جس سے یہ "برلن کا ہیرو" مشہور ہے۔ لیکن روس کے رنگ نرالے ہوتے ہیں۔ زوکوف تمبر ۱۹۴۵ء میں آئزن ہاور سے ملنے امریکہ جارہا تھا کہ اعلان ہوگیا کہ وہ "بیمار" ہے۔ اس بیماری کے بعد وہ رفتہ رفتہ بالکل گمنامی میں پڑگیا۔ بیریا کے بعد اسے گوشہ گمنامی سے نکالا گیا۔ اب مالنخوف کے بعد وہ وزیر دفاع بن گیا ہے نئے وزیر اعظم مارشل نکولائی بلگانن ہیں۔ ان کی عمر تو فوجی کی سی نہیں گزری لیکن دوسری عالمگیر جنگ میں وہ ماسکو کی لڑائیوں میں شریک ہوئے اور بالآخر مارشل بنادیئے گئے۔ زوکوف اور بلگانن کے اس طرح اوپر آنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تبدیلیوں میں فوج کا بڑا ہاتھ ہے۔ نیز یہ بھی کہ آئندہ روسی پالیسی زیادہ سے زیادہ "فوجی" ہوگی۔

تبدیلی کے محرکات

مالنخوف نے اپنے استعفے میں کہا ہے کہ وہ ملک کے مفاد کی خاطر وزارت عظمیٰ سے علیحدہ ہورہے ہیں۔ استعفے میں انہوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ وہ ناتجربہ کاری کی وجہ روس کے زرعی اور صنعتی معاملات کو ٹھیک طرح نپٹا نہیں سکے۔ اس اعتراف کو رضاکارانہ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پس پردہ کوئی اور بول رہا ہے اور مالنخوف نے یہ الفاظ خود نہیں کہے بلکہ ان سے کہلوائے گئے ــــ کوئی ایک ہفتہ پہلے پارٹی سکریٹری، کروشیف نے مالنخوف پر یہ اعتراض کیا تھا کہ بڑی صنعتوں کے مقابلہ میں اشیائے صرف کی پیداوار پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے: نئے وزیر اعظم، بلگانن کے متعلق انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ وہ بڑے کارخانوں کی ترقی پر مناسب توجہ دیں گے نیز اشیائے صرف کی پیداوار کا اتنا خیال رکھیں گے کہ ان سے عوام کا معیار زیست بلند ہوسکے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مالنخوف محض ناتجربہ کاری کی بناء پر علیحدہ ہوئے ہیں تو بظاہر یہ سمجھنا چاہیئے کہ نئے وزیر اعظم ان کے مقابلے میں امور متعلقہ کا پورا تجربہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مارشل بلگانن کو نہ زراعت کا تجربہ ہے نہ بڑی صنعتوں کا اور نہ اشیائے صرف کا۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ان کی ترقی بڑھتے ہوئے فوجی اثر و اقتدار کی مظہر ہے۔

اب بظاہر اقتدار کے مالک بلگانن اور موجودہ وزیر خارجہ، مالوٹوف، ہیں۔ لیکن ان کے پس پردہ طاقت کروشیف کی ہے جنہوں نے آہستہ آہستہ مالنخوف کو پس پشت ڈال دیا تھا یہاں تک کہ یہ قیاس کیا جانے لگا تھا کہ مالنخوف معزول کردیئے گئے ہیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ مالنخوف کے استعفے اور بلگانن کی تقرری کا اعلان کروشیف نے کیا۔ یہ بھی کم قابلِ ذکر نہیں کہ مالنخوف کو غدار کہا گیا نہ انہیں سزا دی گئی بلکہ استعفے کے بعد انہیں نائب وزیر اعظم بنادیا گیا۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ کسی روسی لیڈر کو معزولی کے بعد انتہائی سزا نہیں دی گئی۔ ویسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مالنخوف کی قسمت کا آخری فیصلہ ہوگیا ہے۔ بہرحال آج جو افراد بالائے سطح آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سبھی سٹالن کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی پالیسی سخت ہوگی۔ ایک اطلاع کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوگا: گھروالوں کے لئے سختی اور ہمسایوں کے لئے مصیبت۔ کروشیف نے اپنی تقریروں میں اس پر زور دیا ہے کہ مالنخوف کے عہد میں بڑی صنعتوں کو ثانوی حیثیت دیدی گئی تھی۔ بڑی صنعتوں سے مراد جنگی کارخانے ہیں۔ صحیح تر الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ روس کی حکمت عملی یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ زراعت ترقی کرے اور اشیائے صرف کی پیداوار بڑھے بلکہ جنگی آلات زیادہ سے زیادہ پیدا کئے جائیں۔ یہ واضح رہے کہ روس اور روس کے حلقہ بگوش ممالک کو تعداد کے اعتبار سے تو اقوام مغرب پر فوجی برتری حاصل ہے۔ لیکن آلاتی برتری مغرب ہی کو ہے۔ روس کی انتہائی کوشش ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کرے۔ گویا اب نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اہل روس کو روزمرہ کی زندگی میں زیادہ قربانیاں برداشت کرنا ہوں گی اور مغرب کو روس کی سخت گیر پالیسی کا حریف بننا ہوگا۔ مرکزی پارٹی کے جس اجلاس میں مالنخوف کے استعفے کا اعلان ہوا وہ دراصل وزیر خارجہ، مالوٹوف کی تقریر کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ اس تقریر میں بڑی تعلّی سے کام لیا گیا اور مالوٹوف نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہائیڈروجن بم اور اسلحہ کے بارے میں امریکہ روس سے پیچھے رہ گیا ہے

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان تبدیلیوں سے بیرون روس بالخصوص مغرب میں عام طور پر یہ سوال پوچھا جارہا ہے کہ آیا روس کا رویہ امن پسندانہ ہوگا یا جنگجویانہ۔ اس سوال کا حتمی جواب اس وقت نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ جو کچھ روس میں ہورہا ہے، یا ہونے والا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مغرب کو بہرحال روس پر کڑی نگاہ رکھنی ہوگی اور آنے والے حوادث کے لئے پوری طرح تیار رہنا ہوگا۔ صدر آئزن ہاور نے مستقبل سے متعلق پیش گوئی کئے بغیر اس تیاری پر زور دیا ہے۔

اعلیٰ کانفرنس

تازہ تبدیلیوں سے پھر یہ سوال سامنے آگیا کہ کیا چرچل اب بھی اپنی اس تجویز پر مصر ہیں کہ دول عظمیٰ کے قائدین اعلیٰ کی کانفرنس ہو؟ اس قسم کی تجویز فرانس کی طرف سے بھی کچھ عرصہ سے پیش کی جارہی ہے۔ مالوٹوف نے بھی محولہ بالا تقریر میں پھر اس قسم کی کانفرنس کا ذکر کیا۔ بشرطیکہ معاہدات پیرس کی تصدیق روک دی جائے۔ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اگر ایسا ہوجائے تو جرمنی کی وحدت کا مسئلہ خاطر خواہ طور پر حل ہوسکتا ہے۔ اقوام مغرب اس دام میں آنے کے لئے تیار نہیں ان کا رویہ یہ ہے کہ ٹھیک ہے ایسی کانفرنس منعقد ہونی چاہیئے لیکن معاہدات پیرس کی تصدیق کے بعد خود چرچل نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ماسکو سے انکشاف ہوا ہے کہ مالوٹوف نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ فارموسا کیلئے جنیوا کانفرنس کی طرح ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے۔ برطانیہ روس اور ہندوستان داعی ممالک ہوں اور چین، امریکہ، فرانس، برما، انڈونیشیا، پاکستان اور سیلون مدعو کئے جائیں۔ اس کانفرنس میں قومی چین کو شامل نہیں کیا گیا۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

باب المراسلات

طلوع اسلام اور اشتراکیت

ایک صاحب کوئٹہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آج سے چند روز قبل الفضل میں پڑھا تھا کہ طلوع اسلام پاکستان میں اشتراکیت کا علم بردار ہے۔ مقام افسوس ہے کہ انہوں نے کیسی غلط بیانی سے کام لیا۔ مجھے تو طلوع اسلام سے ایسی بو نہیں آتی۔"

طلوع اسلام: غالبؔ نے اپنے ایک مخالف کے متعلق لکھا تھا کہ اسے گالی دینا بھی نہیں آتی۔ یہی کیفیت ان قادیانی حضرات کی ہے۔ اگرچہ ان کے ہاں گالیاں دینے کی عادت بہت پرانی ہے۔ لیکن انہیں گالی دینے کا سلیقہ ابھی تک نہیں آیا۔ یہ طلوع اسلام کو اشتراکیت کی گالی دیتے ہیں۔ لیکن یہ اس قدر بودی گالی ہے کہ جس شخص نے طلوع اسلام کے دو چار پرچے بھی دیکھ لئے ہوں وہ جھٹ کہہ اٹھے گا کہ ھٰذَا اِفْكٌ عَظِيْمٌ۔ اس برصغیر میں طلوع اسلام ہی وہ پرچہ ہے جس نے نہایت سائنٹفک طریقہ سے اشتراکیت کے فلسفہ کا تجزیہ کرکے اس کے عناصر ترکیبی کو الگ الگ کرکے دکھایا اور اس کے بعد ان عناصر میں سے ایک ایک عنصر کو لے کر یہ بتایا کہ یہ کس طرح اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف جاتا ہے۔ اور اس طرح اس حقیقت کو بے نقاب کرکے رکھ دیا کہ

"یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کمیونزم کا بھی قائل ہو اور اسلامی فلسفۂ زندگی کا بھی۔"

اس ضمن میں اگر کوئی صاحب کم از کم ان دو خطوط ہی کو پڑھ لیں جو "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ میں دسویں اور گیارھویں نمبر میں شائع ہوئے ہیں تو وہ نہایت آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ طلوع اسلام نے کس کامیابی سے اشتراکیت کے فلسفہ کو اسلام کا نقیض ثابت کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے اور اس حقیقت کو ہم فخریہ نہیں بلکہ بطور تحدیث نعمت بیان کرتے ہیں) کہ طلوع اسلام کی اس کوشش نے ملک کے ہزارہا نوجوانوں کو اشتراکیت کے انسان کش اور اسلام سوز غار میں گرتے گرتے بچا لیا۔ اب اگر کوئی شخص اسی طلوع اسلام کے متعلق یہ کہے کہ یہ پاکستان میں اشتراکیت کا علم بردار ہے تو اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اُسے گالی دینا بھی نہیں آتی۔

اصل یہ ہے کہ طلوع اسلام قادیانیت کے لئے ایسا عصائے کلیمی ثابت ہوا ہے کہ ان کی نگاہ فریب رسیاں بے بس ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سے پہلے ان حضرات کا مقابلہ مولویوں سے ہوتا تھا جو روایات کی رُو سے ان سے مناظرے کرتے تھے۔ روایات کی حقیقت خود مرزا صاحب کے الفاظ میں ایک مداری کے پٹارے کی سی ہے جس میں سے ہر شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق جو جی چاہے نکال سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے محاذ پر ایک فیصلہ کن حقیقت کبھی سامنے نہیں آسکتی تھی۔ طلوع اسلام نے خالص قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ "آنیوالے" کا تصور مجوسیت کی پیداوار ہے جسے قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن خدا کی آخری کتاب اور اس کے لانے والے (نبی اکرم صلعم) آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کسی آنے والے کا عقیدہ قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن کا محاذ وہ محاذ ہے جس میں کوئی روایت پرست ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ قادیانی حضرات پر یہ ضرب اتنی کاری پڑی ہے کہ وہ اس سے بالکل بوکھلا گئے ہیں۔ اس بوکھلاہٹ کا نتیجہ ہے کہ وہ اب طلوع اسلام کو اس طرح بدنام کرنے پر اُتر آئے ہیں تاکہ اور نہیں تو کم از کم) ان کے اپنے عقیدتمندوں کی توجہ اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری سمت مُڑ جائے۔

واضح رہے کہ طلوع اسلام نہ کسی فرقہ کا حامی ہے اور نہ کسی فرقہ کا، محض اس کے فرقہ ہونے کی جہت سے مخالف۔ وہ ہر اس بات کی حمایت کرتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو خواہ وہ کہیں سے بھی اُٹھے اور ہر اس نظریۂ زندگی کی مخالفت کرتا ہے جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ وہ کسی سرچشمہ سے اُبھرے۔ اس پر قرآن کی رُو سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ جس طرح اشتراکیت کا فلسفہ نوع انسانی کے لئے سم قاتل ہے، اسی طرح کسی آنے والے کا تصور، اسلام کے لئے زہر ہلاہل ہے۔ لہٰذا وہ ان دونوں کی مخالفت کو حق کا تقاضا سمجھتا ہے۔ وہ نہ ان کی خاطر قرآن کو چھوڑ سکتا ہے نہ اُن کی۔ وہ ایسا کسی کی خاطر بھی نہیں کر سکتا۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۴۴۰ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۴۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۳۲۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

اسباب زوال اُمت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو، طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سچی ہوئی تاریخ۔ دو سو چھپن صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

مزاج شناس رسولؐ — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسولؐ! یہ مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۴ صفحات قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ قریباً چار سو صفحات قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۳۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے۔

نوٹ: تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس ۳۱۳، کراچی

نقد و نظر

مکاتیبِ اقبال

علامہ اقبال کے اردو خطوط کے دو مجموعے اس سے پہلے اقبالنامہ کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان ۷۹ خطوط پر مشتمل ہے جو حضرت علامہ نے خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم کے نام ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھے۔ یہ مجموعہ محترم جسٹس ایس اے رحمان کی تصدیق اور پیش لفظ کے ساتھ بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور نے بڑی نفاست سے شائع کیا ہے۔ قیمت اس کی ایک روپیہ چار آنے ہے۔

ہمیں خان نیاز الدین خاں مرحوم سے تو تعارف حاصل نہ تھا لیکن ان کے فرزند رشید (جن کی اجازت سے یہ خطوط شائع ہوئے ہیں) سے ہمیں شرفِ نیاز حاصل ہے۔ ان کی شرافت اور فراست، ذہانت اور نجابت، سلامتیٔ طبع اور پاکیزگیٔ ذوق سے اس شجرِ بلند کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کے یہ گلِ سرسبد ہیں۔ خطوط زیادہ نجی قسم کے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں بعض باتیں ایسی آگئی ہیں جو عام دلچسپی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہیں۔

دسمبر ۱۹۵۴ء کے طلوعِ اسلام میں آپ نے سلیم کے نام وہ خط دیکھا ہوگا جس میں بتایا گیا ہے کہ تصوف اپنی اصل و بنیاد کی رُو سے کس قدر غیر قرآنی تصور ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس مجموعہ کا پہلا خط اسی موضوع پر ہے۔ اس خط میں حضرت علامہ لکھتے ہیں:

> سید ولی اللہ شاہ صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے یہی افلاطونیت جدید ہے جس کا اشارہ میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ فلسفۂ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس کو اس کے ایک پیرو فلاطینس نے مذہب کی صورت میں پیش کیا.. مسلمانوں میں یہ مذہب حرّان کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بیہودگی پر تعمیر کی گئی۔

مسلمان اس تصوف سے کس حد تک متاثر ہیں، اس کے متعلق وہ اپنے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ پر عجمی تصوف غالب ہے وہ عربیت کے تخیلات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں مجھے یقین ہے اگر نبی کریمؐ بھی دوبارہ پیدا ہو کر اس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات اور اثرات کے ہوتے ہوئے حقائقِ اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں۔

علامہ اقبال، دین کے بارے میں قرآن کو آخری سند سمجھتے تھے چنانچہ ایک خط میں علماء کے ایک فتوے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> باقی رہا میرا ان لوگوں سے ہم خیال ہونا۔ ہم خیالی صرف اسی حد تک ہے جس حد تک قرآن کا حکم ہو اور بس۔

نجی خطوط میں بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ حضرت علامہ نے اپنے ایک خط میں لکھا:

> میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانہ کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار معلوم ہوگا اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ اس عقیدہ سے متفق نہیں تھے اس لئے انہوں نے اس کے متعلق مزید استفسار کیا ہوگا۔ چنانچہ اس سے اگلے خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں

> "زندگی سے مراد زندہ بجسدِ عنصری نہیں ہے۔ حضرت صدیقؓ نے

(باقی صفحہ پر)

حقائق و عبر

مفتیانِ کرام؟

روزنامہ جنگ (کراچی) کی اشاعت بابت ۴ر جنوری ۱۹۵۵ء میں علامہ شبیر احمد عثمانی (مرحوم) کی بیوہ کی طرف سے ایک چٹھی، مجلس عاملہ، جمیعۃ العلماء اسلام کے نام شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> میں نے تہیہ کیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کی یادگار کے سلسلہ میں مفتی محمد شفیع جیسے مفاد پرست افراد نے جو بددیانتیاں اور خود غرضانہ اقدامات کئے ہیں ان کی تلافی اور اصلاح کی جدوجہد کے لئے آپ سے درخواست کروں۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے بعد موقعہ ملتے ہی مفتی محمد شفیع نے حضرت مرحوم کا نام استعمال کر کے اور قرابت اور جانشینی کا ڈھونگ رچا کر نہ صرف یہ کہ ذاتی اغراض حاصل کئے بلکہ حضرت مرحوم کے ورثاء اور ان کی یادگاروں کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ جس کی بدترین مثال یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مرحوم کے مزار کی زمین اور یادگار (دارالعلوم) کے قیام کے سلسلے میں ہمارے علم و اطلاع کے بغیر ہم سے چھپا کر ہماری درخواست کو میونسپل کارپوریشن میں ردی کی ٹوکری میں ڈلوا دیا۔ اور ہماری وکالت اور پیروی کی بجائے اپنے نام سے ایک جھوٹی سچی درخواست داخل کر کے وہ زمین اپنے نام سے حاصل کر لی اور اس طرح ہم لوگوں کو دھوکے میں رکھ کر انہوں نے اس زمین کو ہم سے چھین کر اپنے لئے اور اپنے ذاتی مفاد اور اغراض کے حصول کے لئے راستہ ہموار کر لیا۔

اس کے بعد انہوں نے جمیعۃ العلماء کی مجلس عاملہ سے درخواست کی ہے کہ وہ "حضرت شیخ الاسلام کی اس اہم یادگار اور زمین کو غلط اور غیر مستحق افراد کی دستبرد سے بچانے کے لئے مناسب تجاویز پر غور کریں"۔

یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ اس درخواست پر جمیعت العلماء کی مجلس عاملہ نے کیا کارروائی کی۔ اور اگر انہوں نے مفتی صاحب سے جواب طلب کیا تو انہوں نے اپنے جواب میں کیا کہا۔ لیکن ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ مفتی صاحب جس فقہ کے ماہر ہیں (اور اس کی بنیاد پر فتاوے صادر فرماتے رہتے ہیں) اس فقہ میں کتاب الحیل بھی ہوتی ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کس قسم کی شرعی حیلہ کاریوں "سے جرم کی سزا سے بچ سکتا ہے۔ قارئین شاید متعجب ہوں گے کہ اس میں کس قسم کی حیلہ کاریاں لکھی ہوتی ہیں؟ ان کے رفعِ تعجب کے لئے ایک مثال کافی ہوگی باپ بیٹا سرقہ (چوری) کے جرم میں ماخوذ ہو گئے۔ ملزم معہ مال گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا۔ ملزمین نے واقعہ کا اقرار کیا۔ اب ظاہر ہے کہ سرقہ کی سزا میں ان کے ہاتھ کاٹ دئیے جاتے۔ لیکن اس مقام پر فقہ کی کتاب الحیل آگے بڑھی۔ اُس کی رُو سے باپ نے کہا کہ میں نے صرف مکان میں نقب لگائی تھی۔ مال نہیں نکالا تھا۔ اس لئے میں سرقہ کے جرم کا مرتکب نہیں ہوں۔ بیٹے نے کہا کہ میں نے نقب زدہ مکان سے مال نکالا تھا اس لئے وہ مال محفوظ نہیں تھا۔ (اس مکان میں تھا جس کی دیوار کھلی تھی۔) اور سرقہ کے لئے ضروری ہے کہ مال محفوظ ہو۔ اس لئے میں بھی سرقہ کے جرم کا مرتکب نہیں۔ فقہ کی رو سے دونوں کے دلائل قوی تھے۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی سارق (چور) نہیں قرار پا سکتا تھا۔

مفتی محمد شفیع صاحب فقہ کے عالم ہیں۔ اس لئے وہ لامحالہ اس کی کتاب الحیل کے بھی ماہر ہوں گے۔ اس لئے اگر وہ سب کچھ ثابت بھی ہو جائے جس کا ذکر مندرجہ صدر چٹھی میں کیا گیا ہے، تو بھی اُن کے پاس ایسی "شرعی حیلہ کاریاں" بہت ہوں گی جن کی بناء پر وہ کسی شرعی عدالت کی گرفت میں نہیں آسکیں گے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ "عنداللہ" بھی ماخوذ نہیں ہوں گے!

حقائق و عبر

قارئین کو یاد ہوگا کہ مفتی محمد شفیع صاحب، دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے اور مجلس آئین ساز کے "تعلیمات اسلامی بورڈ" کے رکن جس کا فریضہ یہ بتانا تھا کہ پاکستان میں شرعی نظام کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ یہ حضرات جب وفات پا جائیں گے تو ان کا شمار "ائمہ کرام" میں ہو جائے گا اور یہ اُن "اسلاف" کے زمرے میں شامل ہو جائیں گے جن کے مسلک کی اتباع اُمّت کے لئے لازمی ہوتی ہے۔

۲- سانپ اور مولوی

"ٹائمز آف انڈیا" میں ایک خبر چھپی ہے کہ جب گاندھی جی کے آشرم میں بہت سے چوہے پیدا ہو گئے جو ان کے کاغذات خراب کرتے تھے تو انہوں نے پونہ کے کسی ڈاکٹر سے ایسے سانپ منگائے جو چوہوں کو کھا جاتے تھے لیکن انسانوں کے لئے بالکل بے ضرر تھے۔ کیونکہ ان میں زہر نہیں تھا (چنانچہ اس ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کے پاس اب بھی اس قسم کے کئی سانپ موجود ہیں) اس سے ہمیں نیاز فتحپوری کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ انہوں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ جس طرح سانپوں کی کئی قسمیں ہیں اسی طرح مولویوں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ سانپوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو زہریلے نہیں ہوتے لیکن مولویوں میں ایسی کوئی قسم نہیں پائی جاتی۔

فطرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس قسم کے بے ضرر (بلکہ مفید) سانپ تو ہندوستان میں رہ گئے اور مولوی صاحبان پاکستان آ گئے تاکہ یہاں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکے۔ کیا یہ تقسیم بھی کہیں "ریڈکلف" صاحب ہی کی نظرِ عنایت کا نتیجہ نہیں؟

نقد و نظر

(صفحہ ۱۱ سے آگے)

قرآن کی آیت پڑھی تھی قد خلت من قبلہ الرسل اور یہ حق ہے۔

مکتوب الیہ اس مختصر سے اشارہ سے پوری بات سمجھ گئے ہوں گے لیکن عام قارئین کے لئے اس بات میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی اکرمؐ وفات پا گئے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں۔ اور جو وفات پا جائے اس کا اس دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اب رسول اللہ صلعم سے مستفید ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم ان کی رسالت (یعنی قرآن) سے مستفیض ہوں یا حضورؐ کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں سے جن کا ذکر قرآن میں ملتا ہے اور جن کی تائید کتب احادیث و آثار کے مختلف مقامات سے ہوتی ہے۔

علامہ اقبال قرآنی تعلیم کے علمبردار تھے اور اس باب میں انہوں نے جو قرآن کی خدمت کی ہے اس پر ہمارا دورجس قدر بھی فخر کرے کم ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں بشریت کی خامیاں موجود ہیں جن کا اظہار ان کے کلام میں بھی ہو جاتا ہے اور نجی خطوط میں بھی۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> قلندر صاحب بڑے پایہ کے بزرگ تھے اُن کے عرس پر روپیہ صرف کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بڑی برکت کا باعث ہے۔

یا مثلاً ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

> قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیئے تاکہ قلب محمدیؐ نسبت پیدا کرے۔ اس نسبت محمدیہؐ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معانی بھی آتے ہوں خلوص و محبت کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ (غالباً غیر شعوری طور پر) اُن جذبات کا اظہار ہے جو اُن کے بچپن کی تعلیم اور ماحول کی وجہ سے ان کے تحت الشعور میں جاگزیں تھے اور جن کو شعوری تدبر و تفکر بھی جڑ سے نہیں نکال سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رہنمائی کے لئے صرف وحی کو سند قرار دیا ہے نہ کہ کسی انسان کو۔ اسلئے کہ انسان خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو اپنے ماحول اور وراثتی اثرات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔

کیا ترکی نے اسلام ترک کر دیا ہے

(صفحہ ۱۴ سے آگے)

> اسلامی ریاست برقرار تھی۔ اس ریاست کے انتشار کے بعد کئی سلطنتیں وجود میں آ گئی ہیں۔ اب یہ تخیل بے اثر ہو گیا ہے اور اسلام کی تنظیم جدید میں ایک زندگی بخش عنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہو سکتا۔

مذاکرۃ الصدر اصلاحات پر جس نے جو اجمالی بحث کی ہے اس میں میرا روئے سخن پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا۔ پنڈت جی نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ترکوں اور ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ تاریخ کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانہ میں ہوا جبکہ وحدت انسانی کے قدیم اصول جیسے خونی رشتہ اور ملوکیت ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ پس اسلام نے وحدت انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ روح انسانی در یافت کیا۔ نوع انسانی کو اسلام کا اجتماعی پیغام یہ ہے کہ "نسل اور قیود سے آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ"۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو کسی بعض نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نقطۂ نظر پیدا کر دیتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری قائم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے جو اہم ترین کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دیئے ہیں وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیئے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام نسل کا سرے سے مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشرتی اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا کہ بتدریج نسلی عصبیت کو مٹایا جائے اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں تصادم کم سے کم امکان ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے "ہم نے تم کو قبائل میں اس لئے پیدا کیا کہ تم پہچانے جا سکو۔ لیکن تم میں سے وہی شخص خدا کی نظر میں بہترین ہے جس کی زندگی پاک ہے"۔ اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ مسئلہ نسل کس قدر زبردست ہے اور نوع انسان سے نسلی امتیاز مٹانے کے لئے کس قدر وقت درکار ہے تو مسئلہ نسل کے متعلق صرف اسلام ہی کا نقطۂ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عنصر ہے بغیر نسلی امتیازات پر زور دیئے) معقول اور قابل عمل نظر آئے گا۔ سر آرتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل" میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

> "اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے۔ اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی دائمی امن حاصل کیا جائے۔ یا فطرت کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی قدیم راہ عمل اختیار کرے جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں"۔

لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر ہے تو وہ روح اسلام کے خلاف اس قدر نہیں جا رہا ہے جس قدر کہ روح عصر کے خلاف۔ اگر وہ نسلوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو عصر جدید کی روح شکست دے دے گی کیونکہ عصر جدید کی روح بالکل روح اسلام کے مطابق ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحاد تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا
(اقبال)

مزاج شناسِ رسول

جماعت اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹرشپ پر
طلوع اسلام کا بے لاگ تبصرہ

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

اسلامی نظام

قیمت -/۲ روپے

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیہ

سلسلہ مطبوعات طلوع اسلام

بچوں، عورتوں، کم پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری ملازموں کیلئے

اسلامی معاشرت

جس میں آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں
اور قرآن کی رو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیئے

پرویز

شائع کردہ
ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۱۹۲ صفحات - مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

دورِ حاضرہ کی ایک عجیب و غریب کتاب

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

ایسے متعدد امور کے متعلق جنہیں
سمجھا کچھ اور جاتا ہے اور وہ ہیں کچھ اور

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی

ضخامت ۴۰۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش،
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

این کتاب از آسمانے دیگر است

ابلیس و آدم

انسانی تخلیق، نظریۂ ارتقا، قصۂ آدم، ابلیس، شیطان، جنات،
ملائکہ اور وحی و رسالت کے متعلق تفصیلی مباحث شامل ہیں۔
ایسے اہم عنوانات، قرآنی ارشادات اور جناب پرویز کا قلم
عقل و عشق کا ایسا حسین امتزاج شاید ہی کہیں اور ملے۔

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی

مجلد ۵۳

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi, and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi,
Published by Khurshid Alam from Tulu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi — Editor Khurshid Alam